علمی، ادبی، دینی، وتبلیغی رسالہ

ماہنامہ

اذان بلال آگرہ

جلد ۳۷

شمارہ:۱،۲

جمادی الثانیہ، رجب ۱۴۴۶ھ مطابق جنوری، فروری ۲۰۲۵ء

مدیر: ابوالبرکات مظاہری

بیادگار

حضرت مولانا مفتی محمود الحسن گنگوہیؒ

سرپرست

حضرت مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی

ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ

موبائل نمبر: 9557358285

9411401142

فون: ۰۵۶۲-۲۵۲۰۷۴۸

زرتعاون ہندوستان سے

فی شمارہ.........۲۵/روپے

سالانہ.........۲۵۰/روپے

خصوصی.........۲۰۰۰/روپے

سہ سالہ.........۷۵۰/روپے

لائف ممبری.....۱۰۰۰۰/روپے

بیرون ممالک

۵۰/امریکی ڈالر کے مساوی

مجلس ادارت

اساتذۂ دارالعلوم آگرہ

○ اس دائرہ میں سرخ نشان علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی، آئندہ کے لئے براہ کرم رقم ارسال فرمادیں

خط وکتابت کا پتہ: منیجر ''اذان بلال'' دارالعلوم آگرہ محلہ پیر جیلانی آگرہ-۴

اس شمارے میں

نمبر شمار	فہرست مضامین	مضمون نگار	صفحہ
۱	نبوت وملوکیت	حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ	۵
۲	ہندوستانی مسلمانوں.....	حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ	۱۷
۳	رمضان کیوں آیا ہے؟	حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب	۲۷
۴	ایک عہد ساز شخصیت	حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ	۳۳
۵	فقہ وفتاوی	مفتی احمد صاحب خانپوری	۳۸
۶	اسمائے حسنیٰ کے معارف	پیر ذوالفقار احمد نقشبندی	۴۹
۷	خبرنامہ	ادارہ	۵۸

Printed at : Rabbani Printers Katra Sheikh Chand Lal Kuan Delhi.110006
Published by:Abul Barakaat Mazahiri Darul Uloom Agra Peer Jilani Agra-4.

مضمون نگار کی ہر بات سے ادارہ ''اذان بلال'' کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ ادارہ

پرنٹر پبلیشر ابوالبرکات مظاہری نے ربانی پرنٹرس کٹرہ شیخ چاندلال کنواں دہلی سے چھپوا کر ''دفتر اذان بلال'' دارالعلوم آگرہ محلہ پیر جیلانی آگرہ نمبر۴۔ یوپی (انڈیا) سے شائع کیا۔

قسط سوم

نبوت وملوکیت

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ

دنیا کی اقوام نے عورت کی تذلیل کی اور اسلام نے اسے مقام بخشا

مثلاً مثال کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ عورت بہت زیادہ کمزور صنف ہے۔ مرد کو اللہ پاک نے قوت بخشی ہے۔ عورت میں وہ قوت نہیں ہے۔ نہ معنوی قوت اتنی ہے نہ ظاہری۔ بدن کے اعتبار سے بھی عورت بہ نسبت مرد کے کمزور ہے، اور اندرونی قوتوں عقل وفراست دونوں کے لحاظ سے بھی مرد سے کمزور ہے۔ تو یہ ایک ناتواں اور ضعیف صنف ہے۔ اسلام نے اس کو اتنا ابھارا، اتنا سہارا دیا کہ اسے احساس نہ پیدا ہو کہ میں کمزور ہوں، شروع سے ابھارنا شروع کیا۔

عورت پر تین ہی حالتیں گذرتی ہیں۔ ایک اس کا بچپن ہے جب وہ اولاد کے درجے میں ہوتی ہے۔ ماں باپ سرپرست ہوتے ہیں۔ دوسرا درجہ جوانی کا ہے جب اس کا نکاح ہو جاتا ہے تو خاوند کے ماتحت آ جاتی ہے۔ اور تیسری حالت یہ ہے اس کی اپنی اولاد سامنے ہو تو ایک خود بیٹی ہے، اور ایک بیٹوں کی ماں بن جائے اور ایک خاوند کی بیوی بنے۔ ان تینوں حالتوں کے اندر اسلام نے اسے ابھارا ہے۔ جب وہ خود بیٹی ہو، تو حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ لڑکے تمہارے حق میں نعمتیں ہیں، ان پر شکر کرو۔ اور لڑکیوں کے بارے میں کہا گیا کہ یہ تمہاری نیکیاں ہیں، گویا نعمت کے اوپر شکر واجب ہے، کفرانِ نعمت کرو گے سزا ملے گی اور لڑکی کو کہا گیا کہ یہ باپ کی حسنات میں داخل ہے۔ نیکیاں جنت میں پہنچاتی ہیں تو یہ تمہیں جنت میں پہنچانے کا

ذریعہ بنیں گی۔اس لیے لڑکی کے اوپر محبت وشفقت زیادہ مبذول کی گئی تا کہ لڑکوں کی نسبت لڑکیوں پر ماں باپ زیادہ شفقت کریں۔

اندازہ کیجئے لڑکوں کو نعمت اور لڑکیوں کو نیکی کہا گیا،تو جیسے ہر نیکی پر توقع ہے کہ اجر ملے گا تو لڑکی کے ہونے پر اجر ملے گا۔لڑکے اگر دس بھی ہو جائیں اس پر اجر کا کوئی سوال نہیں۔شکر کروگے تو ٹھیک ہے،نہیں کروں گے تو گردن نپے گی۔اور لڑکی اگر ہوگئی۔آدمی شکر کرے نہ کرے لیکن خود اس کا ہو جانا ایک مستقل نیکی ہے۔نامۂ اعمال میں اجر لکھا جائے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ اولاد میں گویا ماں باپ کے اوپر اس درجے میں احسان ہے کہ ان کے نامۂ اعمال کو اس نے نیکیوں سے بھر دیا اور شریعت کا منشاء یہ ہے کہ شفقت ورحمت لڑکی کے اوپر زیادہ مبذول ہونی چاہئے۔غرض جب وہ بیٹی ہے تو شریعت نے اس کے ساتھ یہ برتاؤ کیا۔

اور جب وہ منکوحہ ہو کر خاوند کے تحت آئی پھر شریعت نے یہ بتلایا کہ **ان اکرم المومنین احسنکم اخلاقاً الطفکم اھلا** ۔تم میں سب سے زیادہ قابلِ تکریم مسلمان وہ ہے کہ اس کے اخلاق پاکیزہ ہوں اور بیویوں کے ساتھ لطف ومحبت کرے،سخت دلی کا برتاؤ نہ کرے تنگی اور سختی سے پیش نہ آئے۔اگر ان سے کوئی زیادتی بھی ہو تو صبر وتحمل سے کام لے۔تو جب بیوی ہونے کی حالت ہے تو خاوند کو متوجہ کیا کہ یہ تیری سب سے زیادہ شفقت ومحبت کی مستحق ہے۔

اور اس کی اپنی اولاد ہو جائے۔یعنی ماں بنے تو حدیث میں فرمایا گیا کہ اولاد کے لیے ماں کے قدموں کے نیچے جنت ہے،جتنی ماں کی اطاعت کرے گا،جنت اس کے قریب ہوگی۔جتنی نافرمانی کرے گا،اتنی جنت بعید ہوگی،اللہ کی رحمت سے دور ہوتا جائے گا۔معلوم ہوتا ہے کہ عورت کے سر پر حق تعالیٰ کی رحمت مبذول ہوتی ہے کہ اگر اولاد ماں کے قریب ہو جائے تو رحمت قریب ہو جاتی ہے۔

اور یہ کیسے لطف کے ساتھ فرمایا۔یوں بھی فرما دیتے کہ عورت (ماں) کے ہاتھ کے نیچے یا

نگاہوں کے نیچے جنت ہے۔ یہ نہیں فرمایا۔فرمایا قدموں کے نیچے جنت ہے۔گویا مطلب یہ ہے کہ قدم سب سے زیادہ کم درجے کی چیز ہوتی ہے۔انسان کے بدن میں سب سے زیادہ کم رتبہ قدم ہوتے ہیں اور سب سے زیادہ باُرتبہ سر ہوتا ہے۔اولاد کو یہ تنبیہ کی گئی کہ تیرے حق میں اس کے قدم بھی بہت اونچا مرتبہ رکھتے ہیں۔اگر تو ان قدموں کے اوپر ہاتھ رکھے گا تو جنت کو اس کے قدموں میں پائے گا۔گویا انتہائی درجے کی تکریم کی۔

عورت اقوامِ دنیا کی نظر میں

اور یہ اس لیے کہ دنیا کی اقوام نے عورت کو ذلیل کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، اسلام سے پہلے ایک زمانہ تھا جب کہ یہود کا غلبہ تھا۔اب ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان کے مذہب کی چیز تھی یا نہیں تھی۔غالب گمان یہ ہے کہ مذہب کی چیز نہیں تھی۔قومی قانون بنایا گیا تھا۔اس قومیت کے قانون کے تحت یہ چیز تھی اور یونانیوں میں سب سے زیادہ تھی۔وہ یہ کہ عورت پر ماں باپ کو اتنا استحقاق حاصل ہے کہ اسے چاہے باپ قتل کردے چاہے اسے زندہ دفن کردے حتی کہ مشرکین مکہ میں بھی یہ رسم رائج تھی کہ عورت کو زندہ دفن کرتے۔گویا اس زمانے کے قانون نے انہیں یہ حق دیا تھا کہ اگر لڑکی کو گلا گھونٹ کر یا زندہ کو قبر میں ڈال دو، کوئی رکاوٹ ڈالنے والا نہیں کوئی عدالت انہیں سزا نہ دے سکتی تھی۔یونانیوں کے ہاں یہ قانون تھا کہ خاوند جب کسی عورت سے نکاح کر لیتا تھا تو عورت باندی سے بھی کم رتبہ ہوتی تھی۔ذرا سی کوتاہی اور نافرمانی پر اسے حق تھا کہ عورت کی گردن مار دے اور قتل کردے۔انتہا سے زیادہ سزا تھی، یہاں تک کہ اگر عورت سے کوئی برائی ثابت ہوجائے تو گھوڑے کی ٹانگ میں رسی باندھ کر رسی کا ایک سرا عورت کی گردن میں باندھا جاتا تھا اور خاوند گھوڑے پر بیٹھ کر اسے دوڑاتا تھا اور وہ بیچاری گھسٹتی جارہی ہے لہولہان ہورہی ہے۔عورت سے یہ سلوک کر رکھا تھا۔اسلام نے آ کر عورت کو رتبہ بلند کیا۔

اور یہ تو وہ زمانہ تھا جس کو جہالت کا زمانہ کہا جاتا ہے۔آج تمدن کا زمانہ ہے ابھی تقریباً دس پندرہ سال کا عرصہ ہوتا ہے اخبارات میں خبر چھپی تھی کہ یورپ میں ایک کانفرنس منعقد ہوئی کہ اس پر غور کیا جائے کہ عورت کی حیثیت کیا ہے؟ یعنی آج تک یہ نہیں سمجھ سکے کہ عورت کی حیثیت و پوزیشن کیا ہے؟ اور اس کے ساتھ کیا برتاؤ ہونا چاہئے۔مختلف ممالک کے نمائندے جمع ہوئے جنہوں نے اس پر غور کرنا شروع کیا کہ اس کی پوزیشن کیا ہے؟ اور اس کے ساتھ کیا برتاؤ ہونا چاہئے؟ مختلف رائیں ہوئیں۔بعض ملکوں کے نمائندوں نے کہا کہ ہماری رائے یہ ہے کہ عورت انسانیت میں ہی داخل نہیں ہے انسان نام فقط مرد کا ہے،عورت کا نام نہیں ہے، یہ کوئی اور جنس ہے جو مرد کے رحم وکرم پر ہے۔ یہ ایک ملک والوں نے رائے دی، پھر آراء میں اختلاف ہوتا رہا، بالآخر اس پر سب کا اتفاق ہوگیا کہ عورت مرد کی تفریح کا ایک آلہ ہے کھلونا ہے کہ مرد اس سے تفریح کرسکتا ہے اس سے زیادہ کوئی پوزیشن عورت کی نہیں ہے اس تفریح کی وجہ سے قدر کرتے ہیں۔عورت کے مرتبے کی وجہ سے قدر نہیں کرتے۔ چوں کہ اپنی غرض متعلق ہے اس واسطے اس کی حفاظت کی جاتی ہے۔آلۂ تفریح ہے اس لیے اس کو سجاتے ہیں۔جیسے لڑکیاں جب گُڑیوں سے کھیلتی ہیں تو دلہن کو بڑے اچھے اچھے کپڑے پہناتی ہیں۔اس کو زیور بھی پہناتی ہیں۔ اور بعض بے وقوف جب ان کی آپس میں شادیاں کرتی ہیں تو دس دس روپے کا جہیز بھی اسے دیتی ہیں۔

یہ اس لیے نہیں ہوتا کہ ان کے دل میں گُڑیا کی کوئی وقعت ہے۔ وہ تو ایک کھلونا ہے اپنی تفریح طبع کے لیے اس گڑیا کو لباس پہنا کے سجا دیتے ہیں۔ چوں کہ عورت بھی تفریح کا آلہ ہے، اس لیے اس کو سجا دیا۔زیور پہنا دیا، ورنہ اس کا کوئی خاص حق نہیں ہے۔

خاوند، بیوی بلحاظ حقوق مساوی ہیں

لیکن اسلام نے آ کران کے برخلاف عورتوں کوحقوق دیئےاورفرمایاو لھن مثل الذی علیھن بالمعروف جوعورت پرخاوند کےحقوق واجب ہیں وہی خاوند پرعورت کےحقوق واجب ہیں۔ وہ حقوق میں کمی کرے گا اس کوسزادی جائے گی۔عورت کرے گی، اسے سزادی جائے گی۔

تو زوجین میں نکاح کے بعداز دواجی زندگی میں دونوں کا رتبہ حقوق کے لحاظ سے برابرقرار دیا۔ یہ الگ چیز ہے کہ عورت کی عقل میں چوں کہ نقصان یا کمزوری ہے اس واسطے اس کو زیر تربیت رکھا،تو یہ منصب کی بات ہے لیکن حقوق کے درجے میں دونوں کو برابرقرار دیا کہ عورت کےاوپر مرد کےحقوق ہیں تو عورت کے بھی ہیں۔

اگرعورت نافرمانی کرے تو مرد کوطلاق کا مالک بنایا گیا ہے،اگرمرد زیادتی کرے تو عورت کوخلع کا مالک بنایا گیا ہے۔اگراسلامی حکومت ہوتو وہ عدالت میں قاضی کے ہاں درخواست دے سکتی ہے کہ میں خاوند کے ساتھ نباہ نہیں کرسکتی۔ نان ونفقہ خاوند پر واجب ہے، وہ ادانہیں کرتا۔حکومت اس کے اوپر جبر کرے گی اوراگر بالکل علیحدہ ہونا چاہئے تو علحدہ بھی ہوسکتی ہے جس کوخلع کہتے ہیں۔وہ یہ کہ وہ قاضی کے ہاں درخواست کرے گی قاضی،خاوندکو بلاکراس سے مواخذہ کرے گا، کیوں نہیں تم نے حقوق ادا کئے،اگراس نے جواب کچھ معقول دیا فبہا۔ ورنہ قاضی کہے گا نکاح فسخ کردے۔ یہ تیرے پاس نہیں رہنا چاہتی،اگرفسخ نہیں کرے گا تو قاضی عورت کوطلاق دے دے گا۔اورطلاق واقع ہوجائے گی تو اس خلع کا مالک عورت کو بنایا گیا ہے۔غرض اگرایک طرف طلاق کی ملکیت مرد کے لیے رکھی تو خلع کی ملکیت عورت کے لیے رکھی، وہ مجبور ہوکر جدا ہونا چاہے، ہوسکتا ہے، یہ چاہے یہ بھی ہوسکتی ہے۔معلوم ہوا، کہ حقوق کے درجے میں مساوی قرار دیا۔

بعض چیزیں عورت اخلاقاً انجام دیتی ہےاوربعض چیزیں مرد بھی اخلاقاً انجام دیتا ہےلیکن

عورت کے لیے واجب نہیں ہے جیسے مثلاً دودھ پلانا ہے عورت کے ذمے واجب نہیں ہے، وہ مرد سے کہہ سکتی ہے کہ تو خرچ کر کے دودھ پلوا، میں دودھ نہیں پلا سکتی۔ عورت اولاد کے کپڑے سیتی ہے لیکن اگر وہ خاوند سے کہے کہ درزی سے سلواؤ میرے ذمے واجب نہیں ہے تو خاوند ہرگز مجبور نہیں کر سکتا، بہر حال شریعت اسلام میں اس قسم کی چیزیں رکھی گئی ہیں کہ اگر اس کے حقوق ہیں تو اس کے بھی حقوق ہیں، یہ اسلام ہی نے اس کو ابھارا۔ تنگدست اور نازک صنف کو ابھارا، جس کو دنیا کی اقوام نے پامال کر دیا تھا۔

غرض جاہل اقوام نے اس پر یہ حقوق جتلائے کہ اس کی گردن مار سکتے تھے، اس کو ایذائیں پہنچا سکتے تھے اور متمدن اقوام یہاں تک پہنچیں کہ وہ تفریح کا ایک کھلونا ہے اس سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں۔ اسلام نے کہا کہ کھلونا نہیں، بلکہ خانگی زندگی میں برابر کی حق دار ہے، جس طرح کہ خاوند کے انتقال کے بعد اسی کی اولاد وارث ہوگی، دوسرے اس کے وارث ہوں گے، عورت کو وراثت پہنچے گی۔ جس طرح سے عورت کے انتقال کے بعد خاوند کو وراثت میں حصہ ملتا ہے، عورت کو بھی خاوند کا وارث قرار دیا گیا۔

ولھن مثل الذی علیھن بالمعروف جتنے عورتوں پر خاوندوں کے حقوق عائد ہوتے ہیں۔ اتنا ہی خاوندوں کے اوپر بھی عورتوں کے حقوق عائد ہوتے ہیں، برابری اس حد تک رکھی گئی ہے کہ عورت کوئی باندی اور مملوک نہیں بلکہ شریکِ زندگی اور شریکِ حیات ہے۔

میرے عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کا خاص اصول ہے کہ کمزوروں کو ابھارتا ہے، دبتے کو دباتا نہیں بلکہ دبے ہوئے کو اونچا کرنا چاہتا ہے، کمزوروں کو دباتا نہیں بلکہ اونچا بنانا چاہتا ہے، سب سے زیادہ کمزور صنف عورت تھی۔ اسلام نے اس کے اوپر انتہائی رحم و کرم کیا کہ جب وہ بیٹی ہونے کی حالت میں ہے تو ماں باپ کی نیکیوں کو شمار کیا جا رہا ہے۔ جب وہ منکوحہ بنی، تو خاوند سے کہا گیا تو قابلِ تکریم تب بنے گا جب عورت کے ساتھ نرمی اور مدارات کا برتاؤ

کرے، جب وہ ماں بن گئی تو اولاد سے کہا جنت ماں کے قدموں کے نیچے۔ اگر قدم پر ہاتھ رکھے گا تو جنت کو قریب پائے گا، اگر تو نے ماں کو ستایا تو جنت قریب نہیں ہوگی، آخرت میں نجات نہیں ہوگی یعنی باپ سے زیادہ ماں کا حق قائم کر دیا۔ باپ کے بھی اولاد کے اوپر حقوق ہیں لیکن ماں کے حقوق اس سے زیادہ ہیں۔

ماں کے حقوق باپ سے زیادہ ہیں

اور اس کی وجہ قرآن کریم نے ارشاد فرمائی کہ عورت جتنی مصیبت اولاد کی پرورش میں اٹھاتی ہے باپ نہیں اٹھاتا۔ باپ زیادہ سے زیادہ کماتا ہے۔ میں کہتا ہوں اگر وہ شادی نہ کرتا جب بھی کماتا۔ اپنے لیے کماتا، دوسروں کے لیے کماتا، تو کمانا اس کی طبعی بات ہے وہ ہر صورت سے کماتا، گویا وہ محنت محض بیوی کے لیے نہیں ہوتی، وہ اپنے نفس کے لیے بھی ہوتی ہے، اپنے عزیزوں کے لیے بھی ہوتی ہے لیکن عورت اولاد کے لیے جو محنت گوارا کرتی ہے وہ خاوند نہیں کرسکتا۔ نو مہینے تو پیٹ میں اٹھائی پھرتی ہے جس کو فرمایا گیا۔ **حملته امه کرها و وضعته کرها**۔ اور فرمایا گیا۔

حملته امه وهنا علی وهن وفصله فی عامین ان اشکرلی ولوالدیک.

تھک تھک کر، عاجز آ آ کر نو مہینے اس کو پیٹ میں اٹھاتی ہے۔ اس کے اوپر ایک بوجھ ہے مگر برداشت کر رہی ہے۔

پھر اس کے بعد وضعِ حمل، تو اس کے بارے میں مثل مشہور ہے کہ ''جننا اور مرنا برابر ہوتا ہے'' گویا اس کی زندگی کے لالے ہوتے ہیں۔ باقی اللہ بچادے تو بچادے، ورنہ موتیں واقع ہوجاتی ہیں، نو مہینے وہ مصیبت اٹھائی، اور جننے کی ایک مستقل مصیبت اٹھائی پھر اس کے بعد دو برس اس کو اپنا خون چسانا، دودھ پلانا، یہ اپنے بدن کے اجزاء اس کو پہنچانا یہ خاوند نہیں کرسکتا، بیوی کرتی ہے، یہ ماں ہی کرتی ہے۔ باپ نہیں کرسکتا۔

پھر اگر بچے کو ضد چڑھ گئی کہ میں تو گود میں چڑھ کر سوؤں گا۔تو عورت کو ساری ساری رات گزر جاتی ہے کہ گود میں اٹھائے پھرتی ہے۔ بچہ اگر بیمار ہے تو ماں اس سے پہلے بیمار ہو جاتی ہے۔اس کو الگ دکھ ہوتا ہے۔غرض باپ کی مجال نہیں ہے کہ محنت برداشت کرے، وہ تو مجنوں ہو کے نکل جائے۔

عورت میں جذبۂ خدمت

اگر کہیں ایسا ہو کہ عورت یوں کہے کہ سال یا مہینہ بھر کے لیے خدمات کا تبادلہ کر لیں۔ میں تیری خدمات انجام دوں اور تو بیٹھ کے بال بچے پال، تو ممکن نہیں، دو دن میں اسے جنون ہو جائے گا اور پریشان ہو کے نکل جائے گا۔ یہ عورت ہی کا حوصلہ ہے کہ وہ اس محنت کو برداشت کرتی ہے۔مرد برداشت نہیں کر سکتا۔

وہ ہمارے ہاں ایک کاشتکار کا قصہ مشہور ہے اور قصہ واقعی ہے،فرضی نہیں ہے کہ وہ کاشتکار اپنے کھیت پر گیا۔ وہاں جا کے کھیت کیاری کے کام میں لگ گیا۔تو طریقہ یہ تھا کہ اس کی عورت ٹھیک بارہ بجے کھانا پکا کے لایا کرتی تھی۔ایک دن اتفاق سے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ دیر ہو گئی۔ کاشتکار آئے جائے تو کہاں؟ اسے غصہ چڑھا اس نے سینکڑوں صلواتیں بیوی کو سنائیں کہ تجھ سے کام نہیں ہوتا، اور تو سست ہو گئی ہے اور کمبخت تجھ سے کچھ نہیں نبھتا۔اور میں ہوتا تو یوں کرتا۔اور تو ایسی ہے تو ویسی ہے، بے چاری سنتی رہی۔یعنی صبح سے شام تک لڑکھپ کے بچوں کو الگ پالا، کھانا الگ پکایا،کھیت پر لے کر بھی گئی،اتفاق سے اگر ذرا دیر ہو گئی تو خاوند نے سینکڑوں صلواتیں سنا دیں خیر وہ غریب سنتی رہی۔خاوند کی زبان سے نکلا کہ اگر میں اس کام میں ہوتا تو کبھی یہ بات نہیں ہوتی۔اس نے کہا اچھا پھر دو چار دن کے لیے خدمتوں کا تبادلہ کر لو۔ میں کھیت پر کام کروں گی تو گھر پہ رہ بچوں کو پال اور بارہ بجے کھانا لے کر آ جایا کرنا۔اس نے کہا یہ کون سی بڑی بات

ہے میں کرلوں گا۔اس نے کہا اچھا کل سے پھر یہی ہوگا۔

چناں چہ صبح کو اٹھتے ہی بیوی تو کھیت پر چلی آئی اور کھیتی کا کام شروع کر دیا۔اب یہ خاوند صاحب گھر لیٹے رہے آنکھ کھلی تو ایک بچہ رو دیا۔ یہ اسے سنبھالنے کے لیے گئے تو اُدھر سے دوسرا چلایا۔اسے پکڑنے کے لیے گئے تو تیسرا رویا۔ابھی اس سے نہیں نمٹے کہ معلوم ہوا وہ گھر میں گائے بندھ رہی تھی اس کا بچھڑا رسّہ چھڑا کر گائے کے دودھ پر جا کے لگ گیا۔اسی پر گذر اوقات تھا۔ یہ جلدی سے بچھڑے کو سنبھالنے گیا،تو بچہ چارپائی سے نیچے گر پڑا۔اب وہ چلا رہا ہے،شور مچا رہا ہے، یہ وہاں پہنچے بچھڑا جو وہاں پہنچا اور اس نے دودھ لیا تو گائے گھبرا کے بھاگی اور اس کی رسی چارپائی میں اٹک گئی تو وہ چارپائی سمیت چولھے پر چڑھ گئی۔تو اب چارپائی چولھے کے اوپر رکھی ہوئی ہے بچہ وہاں پڑا ہوا ہے اور ایک بچہ ادھر چلا رہا ہے،اب اسے پریشانی ہے کہ بچوں کو سنبھالوں یا بچھڑے کو سنبھالوں یا کھانا پکاؤں یا دودھ نکالوں، کھڑا ہوا مجنوں کی طرح ہر طرف دیکھ رہا ہے۔ یہاں تک کہ دس گیارہ بج گئے۔وہ بے چاری کھیت کے اوپر محنت کر رہی تھی۔اسے توقع تھی کہ آج بارہ چھوڑ ساڑھے گیارہ بجے کھانا آ جائے گا۔اس لیے کہ مرد بہت قوی ہے، خوب کام انجام دے گا۔ جب بارہ چھوڑ ایک بج گیا اور کوئی نہ آیا۔اس نے کہا کیا قصہ پیش آ گیا۔ وہ آئی تو آ کے دیکھا کہ ایک بچہ ادھر پڑا رو رہا ہے، ایک ادھر رو رہا ہے اور چارپائی چولھے کے اوپر ٹنگ رہی ہے اور گائے چولھے پر چڑھ رہی ہے،اور بچھڑا پڑا ہوا ہے۔نہ کھانا، نہ دودھ، نہ چارپائی نہ اپنے بچے، گھر میں کوئی چیز بھی ٹھکانے پر نہیں اور خاوند صاحب بیٹھے ہوئے ہیں۔

اس نے کہا کیا بات ہے؟ خاوند نے کہا بس کچھ نہیں۔ یہ تیرا ہی کام ہے۔میرے بس کا کچھ نہیں۔ پھر اس نے کھیتی کا کام شروع کیا اور عورت نے گھر کو سنبھالا تو واقعہ یہ ہے کہ عورت کا بڑا حوصلہ ہے کہ گھر میں بچوں کو سنبھالنا کھانا پکانا، گھر کا انتظام کرنا، اور خاوند کے سارے

معمولات اور خدمات کو انجام دینا۔ اگر خاوند کو چار خدمتیں سپرد کر دی جائیں، دیوانہ ہو جائے۔ یہ عورت ہی کر سکتی ہے۔ چوں کہ یہ چیز تھی اس واسطے شریعت اسلام نے اس کا رتبہ بلند کیا۔ باپ سے زیادہ اس کے حقوق بڑھائے۔ مرد کے منصب کے لحاظ سے کتنا ہی بلند سہی۔ لیکن حقوق کے لحاظ سے اتنا بلند نہیں ہے جتنے شریعت نے عورت کے حقوق قائم کئے ہیں۔

تو شریعت کا یہ خاص اصول ہے کہ **ان نمن علی الذین استضعفوا فی الارض**۔ جو زمین میں ضعیف اور کمزور ہیں ہم ان کو ابھاریں گے۔ ہمارا یہ اصول ہے کہ ان کو بلند و بالا کیا جائے تو عورت ضعیف نازک تھی اس لیے اس کو ابھارا۔

یتیم پر شفقت کے لیے ساری امت کو متوجہ کیا گیا

اسی طرح یتیم بے چارہ ضعیف ہوتا ہے۔ ماں باپ اس کے گزر گئے لاوارث رہ گیا۔ کوئی پالنے والا نہیں ہے۔ اس پر شفقت کی۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے۔

اگر کوئی شخص یتیم کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھے تو جتنے بال ہاتھ کے نیچے آئیں اتنی نیکیاں اس کے نامۂ اعمال میں لکھ دی جائیں گی۔

حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا

انا و کافل الیتیم کھاتین

میں اور یتیم کی خدمت کرنے والا جنت میں بالکل اس طرح برابر ہوں گے۔ میں ذرا آگے نکل جاؤں گا۔ وہ کچھ پیچھے رہے گا۔ مگر اس کے رتبے کی معیت وہی ہوگی جو جنت میں مجھے دی جائے گی۔

اور پہلے یتیم خود نبی کریم ﷺ ہیں۔ آپ ﷺ سے زیادہ یتیموں کا والی اور وارث کون ہوسکتا ہے اور آپ ﷺ سے زیادہ یتیموں کو سہارا دینے والا کون ہوسکتا ہے؟ اس واسطے احادیث یتیموں کی خدمت کے فضائل سے بھری پڑی ہیں۔

روح اس کے اندر یہی ہے کہ یتیم کمزور تھا۔ ماں باپ گزر گئے تھے دنیا میں کوئی کسی کا نہیں ہوتا۔ عزیز واقرباء بھی ہوتے ہیں لیکن جب تک خود اپنی غرض متعلق نہ ہو خلوص سے خدمت کرنے والے دنیا میں گنے چنے ہوتے ہیں۔ عام طور سے نہیں ہوتے۔ اس واسطے پوری امت کو متوجہ کیا ہے کہ یتیم کا باپ گزر گیا تو ساری امت بمنزلہ باپ کے ہے۔ ہر انسان اور ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اس کی خدمت کی طرف توجہ کرے۔

تو عورت کمزور تھی اس کی طرف توجہ فرمائی۔ یتیم کمزور تھا اس کی طرف توجہ فرمائی۔

غلاموں کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم

اگر آپ کا کوئی زرخرید غلام ہے وہ بے چارہ کمزور ہے۔ آپ کو آقا سمجھتا ہے، تو اس کے لیے شریعت نے فرمایا۔ **اخوانکم خولکم** ۔ وہ غلام جن کو تم نے خریدا ہے۔ وہ بمنزلہ تمہارے بھائی کے ہیں، جو خود کھاتے ہو وہ انہیں کھلاؤ جو خود پہنتے ہو وہ انہیں پہناؤ۔ جو اپنی اولاد کو تعلیم دیتے ہو وہ انہیں تعلیم دو۔ یعنی برابری کا رتبہ رکھو، پھر اس کی اتنی عزت بڑھائی کہ اگر آقا اور غلام مسجد میں ائیں تو یہ فرق نہیں ہوسکتا کہ غلام پچھلی صف میں آئے اور آقا اگلی صف میں آئے، وہ دوش بدوش برابر کھڑا ہوگا۔ آقا کو کوئی حق نہیں ہے کہ اسے پیچھے ہٹادے۔ شریعت نے مساوات قائم کی۔ تو ادھر فرمایا **اخوانکم خولکم** تمہارے برابر کے بھائی ہیں۔ جو خود کھاتے ہو، انہیں کھلاؤ۔ جو خود پہنتے ہو انہیں پہناؤ۔ ان کو تعلیم اور تادیب کرو۔ حسن سلوک سے ان سے پیش آؤ۔

پھر غلام کے آزاد کرنے کے فضائل احادیث بھری پڑی ہیں کہ اگر کسی نے غلام کو آزاد کردیا فرمایا وہ ایسا ہے جیسے اس نے ایک حج مع عمرے کے انجام دیا۔ جو اس کا اجر ہوتا ہے وہ ایک غلام کو آزاد کرنے میں اجر ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام میں شروع زمانے میں جہاد جتنا زیادہ تھا۔ غلام زیادہ آتے تھے، ان

کو آزاد کرنے کا اتنا دستور تھا کہ روزانہ ہزاروں کی تعداد میں غلام آزاد ہوتے تھے۔ اور ان کو تعلیم دیتے تھے، پڑھاتے تھے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ شروع زمانۂ اسلام میں بڑے بڑے اکابر علماء جن سے دین اور علم پھیلا، زیادہ تر غلام ہوتے تھے، اس لیے کہ ان کے پاس کوئی زیادہ اسبابِ معیشت اور دولت نہیں ہوتی تھی، گھر بار نہیں ہوتا تھا کہ اس میں لگیں وہ خالص دین اور علم کی طرف متوجہ ہو جاتے تھے۔ اس لیے جتنا وہ علم سیکھتے تھے گھر بار والے اتنا نہیں سیکھتے تھے۔ انہیں کچھ دولت کا، کچھ گھر کا شغل بھی ہوتا۔ انہیں فقط علم سیکھنے کا شوق اور شغل ہوتا تھا۔

امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ دیہات کے رہنے والے اور غلام تھے، لیکن آج وہ سارے مسلمانوں کے امام ہیں۔ عطاء بن ابی رباح کے بارے میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ **مارأیت احسن من عطاء ابن ابی رباح** میں نے اپنے زمانے میں عطاء بن ابی رباح سے زیادہ فضیلت والا کوئی شخص نہیں دیکھا۔ تو جس کے علم کی امام ابوحنیفہ تعریف کریں۔ اندازہ کیجئے کہ اس کے علم کا کیا رتبہ ہوگا؟ یہ بھی غلام ہیں۔ تو اتنے بڑے ہیں کہ آج مسلمانوں کے مقتداء ہیں اور اپنی ذات سے دیکھیں تو وہ غلام ہیں۔

صوفیاء اور علماء میں غلام بڑے بڑے اکابر ہوئے، اور بڑی تعداد میں ہوئے۔ یہ شریعت اسلام کی اس ہدایت کا اثر ہے کہ اس نے کمزور دیکھ کر پوری امت کو متوجہ کر دیا۔ ہر آقا کو متوجہ کیا کہ اپنے غلام کو حقیر مت سمجھنا۔

☆☆☆

قسط آخر

انصاف پسند ہم وطنوں کی عدالت میں:

ہندوستانی مسلمانوں کا مقدمہ

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

ملک کے لئے صحیح اور محفوظ راستہ

سچی بات تو یہ ہے کہ ہمارے ملک کے بقاء، ترقی، عزت واستحکام اور اس کا معاصر دنیا اور اس خطرناک وپیچیدہ عالمی صورتحال میں اپنا شایان شان کردار ادا کرنے کے لئے صحیح، محفوظ، باعزت اور بے خطر راستہ وہی ہے جو تحریک آزادی کے مخلص دانشور اور بلند قامت و قیمت رہنماؤں پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا آزاد اور ان کے ساتھیوں نے تجویز کیا تھا اور وہ سچے سکولرزم، صحیح جمہوریت اور ہندو مسلم اتحاد کا راستہ ہے خواہ عارضی ووقتی طور پر کامیابی حاصل ہو ملک کے لئے تباہ کن اور ان قربانیوں پر پانی پھیرنے والا ہے، جو جنگ آزادی میں عمل میں آئیں، اور ملک کو ایسی مشکلات ومسائل سے دوچار کرنے والا ہے جن کا کوئی حل نہیں ہے۔

ملک کے لئے تین بڑے خطرے

اب میں مذہب، انسانی تاریخ، فلسفہ اور اخلاق کا ایک طالب علم ہونے کے ناتہ یہ عرض کرنا چاہتا ہوں، (اور مجھے اندیشہ ہے کہ شاید دوسرا شخص جس پر سیاسی طرز فکر غالب ہے نہ کہے گا) کہ اس ملک کے لئے دو خطرے بڑے تشویشناک ہیں، اور آپ کی پہلی توجہ کے مستحق، ایک ظلم وتشدد کا رجحان، انسانی جان ومال اور عزت وآبرو کی بے قیمتی (خواہ اس کا تعلق کسی فرقہ سے ہو) جس کا ظہور فرقہ وارانہ فسادات، طبقاتی اونچ نیچ کی بنا پر پورے پورے خاندانوں اور محلوں کی

صفائی،تھوڑے سے مالی فائدہ کیلئے انسان کی جان لے لینا،سفاکانہ جرائم ومظالم کی کثرت اور سب کے آخر میں (لیکن سب سے زیادہ شرمناک حقیقت) مطلوب ومتوقع جہیز نہ لانے پر نئی بیاہی دلہنوں کوجلادینا یا زہر دے کر ماردینااوران سے پیچھا چھڑاناہے۔

جولوگ مذہب پر یقین رکھتے ہیں،ان کے لئے تو یہ سمجھنا بہت آسان ہے کہ اس کائنات کا پیدا کرنے والا اور چلانے والا جو ماں سے زیادہ محبت کرنے والا اورمہربان ہے اس عمل سے خوش نہیں ہوسکتا اوراس کوزیادہ دن برداشت نہیں کرے گا،اوراس کے نتیجہ میں ہزاروں کوششوں اورقابلیتوں کے باوجودکوئی ملک پنپ نہیں سکتا،اوروہ معاشرہ زیادہ دن باقی نہیں رہ سکتا،لیکن جولوگ مذاہب پر اعتقادنہیں رکھتے وہ اس تاریخی حقیقت سے واقف ہیں کہ اس سے کم درجہ کے ظلم اورسفاکی کی وجہ سے بڑی بڑی شہنشاہیاں اوروہ تہذیبیں جن کاکسی زمانہ میں ڈنکا بجتا تھا اورآج بھی تاریخ وادب کے صفحات پران کے روشن نقوش ہیں زوال کا شکار ہوگئیں اورداستان پارینہ بن کررہ گئیں،اس صورتحال کی طرف فوری توجہ کی ضرورت ہے،سیاسی مسائل اورانتخابی مہم سے زیادہ اس کے خلاف طوفانی مہم چلانے کی ضرورت ہے،اس کے لئے گاؤں گاؤں محلّہ محلّہ جانے کی ضرورت ہے،سخت قوانین،عبرتناک سزاؤں،ابلاغ عامہ کے ذرائع سے کام لینے اورانتظامیہ کوسخت سے سخت قدم اٹھانے کی ضرورت ہے ورنہ نہ بانس رہے گا نہ بانسری۔

دوسراخطرہ فرقہ پرستی،جارحیت وتشدد کے کھلے رجحانات ہیں جن کے سلسلہ میں ادنیٰ سی رعایت ،لچک اورنرمی سے وقتی طور پرخواہ کچھ فائدہ پہونچ جائے یاپریشانی سے بچاجاسکے،ملک کوزمین دوزاوردھاکہ خیز سرنگوں کے رحم وکرم پرچھوڑدیناہے،جو بالآخر ملک کولے ڈوبے گی،گاندھی جی اس حقیقت کوخوب سمجھتے تھے کہ فرقہ وارانہ منافرت تشدداورجارحیت،پہلے ملک کی آبادی کے دو اہم عنصروں (ہندومسلم فرقوں) کے درمیان اپنا کام کرے گی،پھریہی ذیلی مذہبی اختلافات، طبقات اور برادریوں کی صف آرائی اورنسلی،لسانی،صوبائی،علاقائی تعصّبات کی شکل میں ظاہر

ہوگی،اور جب یہ کام بھی ختم ہوجائے گا تو وہ آگ کی طرح (جب اس کو جلانے کے لئے ایندھن نہ ملے تو اپنے کو کھانے لگتی ہے) ملک کو اور امن پسند شہریوں کو اپنا لقمہ بنالے گی اور یہ ملک تباہ ہوکر رہ جائے گا۔

اس لئے جارحانہ احیائیت (AGRESSIVE REVIVALISM) تشدد،ایک ہی فرقہ سے مطالبات اور اس پر تنقید کا سلسلہ اپنے کو بالکل بدل دینے اور اپنے ملی وتہذیبی و مذہبی تشخصات سے دست بردار ہوجانے کا مسلسل مطالبہ،سیکڑوں اور ہزاروں برس کی سوئی ہوئی بلکہ مری ہوئی تاریخ کو دوبارہ جگانا اور زندہ کرنا،جو تبدیلیاں صدیوں پہلے (اچھی یا بری ہوں، اور ان کو اس ملک کی حقیقت پسند،فراخ دل اور غیرت مند شہریوں نے صدیوں گوارا کیا ان کے سفر کو پہلے قدم سے شروع کرنا اور ان کی تلافی کی کوشش اس ملک کو ان نئے مشکلات ومسائل سے دوچار کرے گی جن کا مقابلہ کرنے کی اس ملک کو نہ فرصت ہے نہ ضرورت،اور اس طرح حکومت انتظامیہ اور دانشور طبقہ کی توانائی بے محل صرف ہوگی،جس کی ملک کو اپنے تعمیری کاموں سالمیت واستحکام میں ضرورت ہے اس لئے اس شگاف کو جبکہ وہ معمولی توجہ اور مسالہ سے بند ہوسکتا ہے اس سے پیشتر بند کردیا جائے،جب وہ ہاتھیوں سے بھی بند نہیں ہوسکے گا،ملک کے اس عمومی وبنیادی مفاد کی خاطر کسی کی ناراضگی یا الیکشن کے نتائج پر اثر پڑنے یا کسی ریاستی ومقامی انتظامیہ کی ناگواری کا خیال نہیں کرنا چاہئے کہ ملک ان سب چیزوں سے زیادہ عزیز اور اصول، مصالح وفوائد پر مقدم ہے۔

اصول پسندی کی ایک روشن مثال

میں اس اصول پسندی کی ایک مثال پیش کرتا ہوں،جو ملک کے عظیم رہنما اور پہلے وزیراعظم پنڈت جواہرلال نہرو نے پیش کی۔

۱۹۵۰ء میں جب کانگریس پر بابو پرشوتم داس ٹنڈن جی کی قیادت میں (جوگانگریس کے صدر ہوگئے تھے) فرقہ پرست عنصر غالب آرہا تھا، اور وہ کانگریس کو سیکولرزم اور ہندو مسلم اتحاد کے بجائے جس کی بنیاد گاندھی جی، جواہر لال نہرو جی اور مولانا آزاد نے ڈالی تھی فرقہ پرستی اور ہندو احیایت HINDU REVIVIOLISM کی طرف پھیرنا چاہتے تھے، اور جمہوریت واکثریت اور اس کی پیروی میں جواہر لال جی سے بھی اس کی توقع کررہے تھے کہ وہ اپنے عمر بھر کے خیالات اور سوچنے کے طرز کو چھوڑ کر کانگریس میں رہنے کے لئے اس کو اختیار کریں گے، جواہر لال جی نے اس سے انکار کردیا اس موقعہ پر انہوں نے جو تقریر کی وہ ہندوستان کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے، گاندھی نگر ناسک میں ۲۱ر ستمبر ۱۹۵۰ء کو انہوں نے فرمایا:

''میں جمہوریت پسند نہیں ہوں اگر اس کا یہ مطلب لیا جاتا ہو کہ میں کسی ہجوم کی رائے کے سامنے جھکوں، میں کبھی ایسی بات نہیں کروں گا جس کے غلط ہونے کا مجھے یقین ہو، اور عوام (ہجوم) چاہتے ہوں کہ اس غلط بات کو میں مانوں ایسی صورت میں یہ ممکن ہے کہ اگر کانگریس چاہے تو میں کانگریس سے باہر نکل کر انفرادی طریقہ پر اپنے خیالات کے لئے لڑوں۔''

''کچھ لوگ مجھ سے آکر کہتے ہیں کہ مجمع فلاں بات نہیں مانتا اور جمہوریت کی آواز آگے بڑھ رہی ہے دراصل یہ بزدلوں کی دلیل ہے اگر جمہوریت کا مطلب ہجوم کے آگے جھکنا ہے تو ایسی جمہوریت کو جہنم واصل ہونا چاہئے اس قسم کی ذہنیت جہاں بھی سر اٹھائے گی میں اس کے خلاف لڑوں گا، ہاں جمہوریت مجھ سے وزارت چھوڑنے کو کہہ سکتی ہے، میں اس کا حکم مانوں گا، اگر کانگریسی یہ چاہتے ہیں کہ وہ آنے والے انتخابات میں چند ووٹ حاصل کرنے کے لئے اپنے اصول ونظریات چھوڑ بیٹھیں تو کانگریس مردہ ہوجائے گی، مجھے ایسی لاش کی ضرورت نہیں ہے''۔ (قومی آواز لکھنؤ ۲۲ر ستمبر ۱۹۵۰ء)

تیسری چیز جوفوری توجہ کی مستحق اور تشویش کا باعث ہے وہ اخلاقی وانتظامی انتشار CORRUPTION ہے جواس حدتک پہونچ گیا ہے جس کی نظیر کم سے کم مجھے اس ملک کی تاریخ میں اس سے پہلے نہیں ملی،آپ اس سلسلہ میں سرکاری رپورٹوں اور ملک کے نظم ونسق کی ظاہری ٹیپ ٹاپ اور ترقی کو نہ دیکھئے،عام شہریوں متوسط درجہ کے آدمیوں اوران لوگوں سے پوچھئے جن کا عدالتوں ، دفاتر،ریلوے ہوائی سروس،پولیس،تھانوں ، ٹیلی فون، ہسپتالوں، سرکاری ٹھیکوں اورزندگی کے مختلف شعبوں سے کام پڑتا رہتا ہے،رشوت کے بغیرادنیٰ درجہ کا کام نہیں ہوسکتا،پیسہ پھانسا جاسکتا ہے،ہرطرح کا غلط فیصلہ حاصل کیا جاسکتا ہے،ہرجگہ فساد کرایا جاسکتا ہے، یہاں تک کہ ملک کے راز بھی بیچے جاسکتے ہیں،دواؤں اورغذاؤں میں ملاوٹ ہورہی ہے،طبی امداد ملنی مشکل ہورہی ہے،مریضوں کے لئے جوانتظامات ہیں وہ بیکار جارہے ہیں،سنگ دلی اپنی انتہا کو پہونچ گئی ہے،ریلوے،ہوائی سروس میں رشوت کی گرم بازاری سے حکومت کوروزانہ لاکھوں کروڑوں روپے کا نقصان ہورہا ہے۔

اس سب کی جڑ میں پیسہ کی حد سے بڑھی ہوئی محبت،خدا کا خوف دل سے نکل جانا اورانسان سے ہمدردی،ملک سے وفاداری اوراس کے مفاد کوترجیح دینے اوراس کے نقصان کا خیال رکھنے کا جذبہ ختم ہوجاتا ہے،ایسی صورت میں ملک صنعتی طور پر،سیاسی طور پر،خارجی تعلقات کی بنیاد پر ترقی اورتعلیم کی اشاعت اورخواندگی کا تناسب بڑھ جانے کے باوجود تیزی سے زوال کی طرف جارہا ہے،لوگ زندگی سے عاجز ہیں اورآخری شرم وناکامی کی بات یہ ہے کہ انگریزوں کے دورغلامی کو یاد کرتے اوراس کی تمنا کرتے ہیں،جب انتظامیہ چوکس تھا،ریلیں وقت پر چلتی اور پہونچتی تھیں، ہسپتال اطمینان اورخوشی اورخدمت راحت کے ٹھکانے تھے،نوجوان اپنی محنت ولیاقت سے پاس ہوتے تھے،تقرریاں اورترقیاں قابلیت اوراستحقاق کی بناپر ہوتی تھیں،اب یہ سب چیزیں خواب وخیال ہوگئیں۔

ہندوستانی پریس اور اخبار نویسوں سے شکایت

حضرات! چونکہ آپ کو کسی روایتی سیاسی کانفرنس میں نہیں بلکہ ایک ایسی بے تکلف مجلس میں شرکت کی دعوت دی گئی ہے، جس میں ہم کو ایک ایسی جماعت کی طرح جو ایک کشتی پر سوار ہے، یا ایک ایسے افراد خاندان کی طرح جو کسی تقریب میں جمع ہیں، ایک دوسرے سے بے تکلف اپنے دل کی بات کہنے اور شکوہ وشکایت کا حق ہے، میں اپنے ملک کے انگریزی، ہندی اور اُردو اخبار نویسوں اور صحافیوں سے کچھ کہنے کی جرأت کرتا ہوں۔

آپ سے زیادہ کون اس بات کو جانتا ہے کہ یگانگت اور محبت بڑھانے اس کے بالمقابل دو فرقوں اور خود ایک فرقہ کے افراد میں تلخی وبدگمانی اور نفرت وکراہت پیدا کرنے میں پریس کو جو دخل ہے وہ کسی دوسرے ادارہ کو نہیں، میں نے ایک مرتبہ اخبار نویسوں اور ایڈیٹروں کی ایک کانفرنس کے نمائندوں کو جو چند سال پہلے لکھنؤ میں ہوئی تھی، خطاب کرتے ہوئے فارسی کا ایک مصرعہ ایک حرف کی ترمیم کے ساتھ پڑھا تھا، شاعر اپنے محبوب سے کہتا ہے ع

زیر قدمت ہزار جان است

تمہارے قدم کے نیچے ہزاروں جانیں ہیں، میں نے صرف ایک حرف بدل کر کہا ع

زیر قلمت ہزار جان است

آپ کے قلم کے نیچے ہزار جانیں ہیں، میں یہ نہیں کہوں گا کہ آہستہ چلیں یا بالکل نہ چلیں میں کہوں گا کہ احتیاط سے چلیں، میں نے ۱۰؍نومبر ۱۹۸۵ء میں مدراس کی پریس کانفرنس میں جو مسلم پرسنل لا کے مسئلہ کے سلسلہ میں ہوئی تھی، کہا تھا کہ میں اخبار کو ایک سچا اور ایماندار کیمرہ سمجھتا ہوں، جس کا کام یہ ہے کہ وہ تصویر کو (اس سے قطع نظر کہ وہ حسین ہے یا بھدی) اپنے اصلی رنگ روپ میں پیش کردے، ملک میں پیش آنے والے واقعات، مختلف فرقوں کے جذبات

وشکایات منعقد ہونے والے احتجاجی جلسوں اور جلوسوں کو اپنے صحیح حجم (BULK) حاضرین کی تعداد کے صحیح اندازہ اور مقررین وسامعین کے اصلی جذبات وکیفیات کے ساتھ پیش کردے تاکہ حکومت ملک اور پبلک کو صورتحال کا صحیح اندازہ ہوسکے، اور وہ اپنے انتظامی، اخلاقی فرائض اور ذمہ داریاں محسوس کریں، میں اس حد تک اس کو ضروری سمجھتا ہوں کہ اگر ہپیز (HIPPIES) یا (ہم سے آپ سے دور) کوڑھیوں یا متعدی امراض رکھنے والوں کی کوئی کانفرنس ہو، تب بھی ہم کو اس کو اس کے حجم کے ساتھ پیش کرنا چاہئے تاکہ ملک کے اصلاحی تربیتی ادارے، حفظان صحت کا نظام اور سماجی سدھار کا کام کرنے والے (SOCIAL WORKERS) اپنی ذمہ داری کو محسوس کریں، اور وقت اور کام کی وسعت وضرورت کے مطابق تیار ہوکر میدان میں آئیں، ملک میں کسی مریضانہ علامت کے ظاہر ہونے یا کسی غلط یا تخریبی رجحان کو پورے طور پر نمایاں نہ کرنے سے ملک ومعاشرہ سخت خطرہ سے دوچار ہوسکتا ہے، اور اقوام وملل کی قدیم تاریخ میں اس کی بہت سی شہادتیں موجود ہیں، ایک وسیع ملک، ایک ترقی یافتہ وطاقتور حکومت، ایک مہذب شہادتیں موجود ہیں، ایک وسیع ملک، ایک ترقی یافتہ وطاقتور حکومت، ایک مہذب وتعلیم یافتہ معاشرہ، بروقت خطرہ اور غیر صحت مندانہ رجحانات اور کوششوں کو روکنے سے غفلت برتنے کے نتیجہ میں بارہا دائمی زوال کا شکار ہوگیا، اور دنیا کی تاریخ میں داستان پارینہ بن کر رہ گیا ہے، ہمارے معزز وعزیز اخبار نویسوں اور ایڈیٹروں کو اپنے ایڈیٹوریلز اور اپنے اظہار رائے کے کالموں میں اپنے نقطۂ نظر اور اپنی پسندیدگی اور ناپسندیدگی کے اظہار کا پورا حق ہے اور ان کے اس حق کو کوئی چھین نہیں سکتا لیکن واقعات کی رپورٹنگ اور مختلف فرقوں اور جماعتوں کے جذبات، شکایات اور مطالبات کے روئیداد پیش کرنے میں ان کو کسی طرح کی رنگ آمیزی اور جانب داری سے کام نہیں لینا چاہئے۔

ملک کی سب سے بڑی اقلیت اور فرقہ (مسلمانوں) کو شکایت ہے کہ ان کے جلسے وجلوسوں،

احتجاج اور مظاہروں اور یہاں تک کہ ان کی ملی تقریبات اور مجلسوں کی صحیح تصویر ہندوستانی پریس میں آنے نہیں پاتی، اور محض اخبارات پڑھ کر کسی کو ان کے احساس کی شدت، ان کی بے چینی، بے اطمینانی اور ان کی اکثریت کے جائز آئینی مطالبے کا اندازہ نہیں ہوسکتا یہ نہ صرف اس مخصوص اقلیت اور فرقہ کے لئے مضر اور اس کے ساتھ ناانصافی ہے، بلکہ ملک وحکومت دونوں کے لئے نقصان رساں اور ان کے حق میں بدخواہی اور بداندیشی ہے کہ ان کو واقعہ کی سنگینی کا علم نہ ہونے پائے اور وہ تھوڑی کوشش سے اس کا تدارک وعلاج نہ کرسکیں، جو بڑھ جانے کے بعد بڑی کوشش سے بعض اوقات ممکن نہیں ہوتا ہے۔

میں آپ کی اجازت سے بہ طور نمونہ اس سلسلہ میں اپنے چند مشاہدات پیش کرنا چاہتا ہوں ۲۷/۲۸/دسمبر ۱۹۷۲ء میں بمبئی میں پہلی مرتبہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا قیام عمل میں اور Y.M.C.A. مدنپورہ کے میدان میں ایک پبلک جلسہ ہوا، جس میں محتاط اندازہ کے مطابق ایک لاکھ کے قریب مجمع تھا، اسی دن آنجہانی عبدالحمید صاحب دلوائی کی قیادت میں ایک مظاہرہ ہوا، جس میں چند درجن سے زیادہ آدمی نہیں تھے، مسلمانوں نے اس پر اپنی سخت ناپسندیدگی کا اظہار کیا، پولیس نے مظاہرین کو اپنے گھیرے میں لے لیا، ورنہ ان کو سخت حالات سے دوچار ہونا پڑتا میں نے خود اگلے روز بمبئی کے انگریزی اخبارات پڑھے، اس میں مسلم پرسنل لا بورڈ کے سلسلہ کے جلسہ کا بہت معمولی طور پر تذکرہ تھا، لیکن دلوائی صاحب کے مظاہرہ کا بہت نمایاں طریقہ پر دکھایا گیا تھا، جس سے ناواقف آدمی سمجھتا کہ اس میں ہزاروں آدمی شریک تھے، اور مسلمانوں کی نمائندگی یہی جلوس کرتا تھا، اس عدم توازن اور حقائق کو نمایاں نہ کرنے کا جو اثر انتظامیہ، ملک کے دانشور اور برادران وطن پر ہوسکتا ہے اس کا اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں۔

دوسری مثال قریبی زمانہ کی ہے ۶/۷/اپریل ۱۹۸۵ء میں کلکتہ میں مسلم پرسنل لا بورڈ کا اجلاس ہوا، ۷/اپریل ۱۹۸۵ء کو شہید مینار میدان میں شام کو پبلک جلسہ ہوا جس میں اچھے تجربہ کاروں کا

اندازہ ہے کہ پانچ لاکھ آدمی شریک تھے جہاں تک نظر کام کرتی تھی، انسانوں کا جنگل نظر آتا تھا، میں بورڈ کا صدر ہوں اور اس جلسہ میں بہ طور خود موجود تھا، اور تقریر بھی کی، اگلے دن میں آسنسول کے لئے روانہ ہو رہا تھا میں نے ہوڑہ اسٹیشن پر جتنے انگریزی اخبارات مل سکے حاصل کئے، جو اخبارات مجھے ملے ان میں کہیں اس جلسہ کا تذکرہ نہ تھا، ایک انگریزی اخبار میں ان الفاظ میں خبر دی گئی تھی '' HUNDREDS OF MUSLIMS ATTENDED '' اب آپ ہی فرمایئے نہ صرف باہر کے لوگوں کو بلکہ کلکتہ کے ان باشندوں کو بھی جن کو اس جلسہ کو دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا صحیح صورتحال اور اپنے ہم وطن بھائیوں کے جذبات کی شدت کا اندازہ کیسے ہوسکتا ہے، اور خود حکومت کی مشینری، عدلیہ، اور انتظامیہ اور ملک کا حقیقت پسند طبقہ اس کا مداوا کیسے کرسکتا ہے؟ مبالغہ نہ ہوگا اگر میں کہوں کہ سیکڑوں مثالوں میں سے یہ دو مثالیں ہیں جو میں نے پیش کیں۔

موجودہ مسئلہ مسلم پرسنل لا بل کے سلسلہ میں بھی یہی تلخ تجربہ ہوا کہ ہمارے انگریزی و ہندی اخبارات نے (بہت خفیف استثناء کے ساتھ) خبریں دینے، تبصرہ کرنے، تردیدی ومخالفانہ مضامین ومراسلات شائع کرنے میں میونسپلٹی اور کارپوریشن کے شہری قانون ONE WAY TRAFFIC کا مظاہرہ کیا ڈھونڈنے پر بھی مطلقہ خواتین کے حقوق کے تحفظ کے زیر بحث بل کے حامیوں یا اس کی وضاحت کرنے والوں کا کوئی مضمون یا مراسلہ دیکھنے میں نہ آیا، اس طرح یہ اخبارات ورسائل (مجھے معاف کیا جائے) ایک ہی نقطۂ نظر کے ترجمان اور پرجوش حامی تھے، جو اکثریتی فرقہ کی اکثریت اور مسلم فرقہ کے انگلیوں پر گنے جانے والے چند افراد کا نقطۂ نظر اور طرز فکر تھا، اور اس سے ملک وبیرون ملک کا کوئی اخبار بیں (جس کی معلومات وخیالات کا انحصار اخبارات کے مطالعہ پر ہو) امن چینی، جوش وخروش اور بے نظیر وحدت، فکر وخیال کا اندازہ نہیں لگا سکتا تھا، جو ہندوستان کے دس یا پندرہ کروڑ مسلمانوں میں پائی جاتی ہے، اور جس سے

واقف ہونا ہر حقیقت پسند، جمہوریت اور آزادی رائے کا احترام کرنے والے محبّ وطن اور ذمہ دار انسان کا فرض ہے۔

آخر میں دہلی ہی کے (جہاں ہم جمع ہیں) نامور اُردو شاعر مرزا غالبؔ کا ایک شعر پڑھتے ہوئے آپ سے رخصت ہوتا ہوں ؎

رکھیو غالبؔ مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

☆☆☆

دعائے مغفرت

محترم قارئین کرام! ۱۵؍جنوری ۲۰۲۵ء کو ایک اندوہناک حادثہ پیش آیا کہ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ناظر عام حضرت مولانا سید جعفر حسنی ندویؒ ایک سڑک حادثہ میں مولائے حقیقی سے جا ملے۔ دار العلوم آگرہ میں حضرت مولانا کے لیے قرآن خوانی اور ایصال ثواب کا اہتمام کیا گیا۔ تعزیتی نشست منعقد کی گئی۔ ادارہ حضرت مولاناؒ کے پسماندگان سے تعزیت مسنونہ پیش کرتا ہے۔ قارئین اذان بلال سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے کہ مولانا مرحومؒ کے لیے آپ سبھی حضرات مغفرت اور رفع درجات کی دعا فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی مغفرت فرمائے اور ان کے درجات کو بلند فرمائے۔ آمین یارب العٰلمین

رمضان کیوں آیا ہے؟

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ

اسلام سے باہر نظر دوڑا کر دیکھئے تو محسوس ہوگا کہ دنیا بھر کے فکری نظام کلیۃً انسان کے دماغ کو مخاطب کرتے ہیں، اور مذہب وتصوف خالصۃً اس کے دل کو۔ ان دونوں میں سے ہر ایک کی الگ الگ بادشاہت ہے جس پر وہ بلاشرکتِ غیرے حکمرانی کرتے ہیں، اور یہ دو بادشاہ نہ صرف یہ کہ ایک ''اقلیم'' میں نہیں سماتے، بلکہ بسا اوقات ایک دوسرے سے برسرِ پیکار نظر آتے ہیں۔ لیکن اسلام بیک وقت انسان کے دل اور دماغ دونوں سے اس طرح خطاب کرتا ہے کہ ان کے درمیان کوئی رسہ کشی پیدا نہیں ہوتی جو انہیں ایک دوسرے کے مدِّ مقابل کھڑا کردے۔ اس کے بجائے ابتداء یہ دونوں اپنی اپنی حدود متعین کر کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں، اور بالآخر ایک دوسرے میں گھل مل کر اس طرح شیر وشکر ہوجاتے ہیں جیسے دو دریاؤں کا سنگم ایک حد پر جا کر دونوں کو یک جان کر دیتا ہے۔ یہ وہ مرحلہ ہے جہاں دل کو ''عشق ومحبت'' کے ساتھ سوچنا سمجھنا'' بھی آجاتا ہے، اور دماغ میں ''سوچنے سمجھنے'' کے ساتھ ''عشق ومحبت'' کی صلاحیت پیدا ہوجاتی ہے۔

اس لطیف حقیقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے جس کی لطافت بیان سے زیادہ ادراک میں ہے اگر انسان قرآن کریم کی اُن آیات پر غور کرے جن میں ''سوچنے سمجھنے'' کو دماغ کے بجائے ''قلوب'' کی صفت قرار دیا گیا ہے تو اس کلامِ الٰہی کے اعجاز کے آگے فصاحت وبلاغت کی پوری کائنات سجدہ ریز نظر آتی ہے۔ اللہ اکبر!

مختصر یہ کہ اسلام کی تعلیمات عقل اور عشق کا ایک ایسا حسین آمیزہ ہیں کہ اگر ان میں سے کسی ایک عنصر کو بھی ختم کردیا جائے تو اس کا سارا حسن ختم ہوجاتا ہے۔ اگر عقائد وعبادات کا نظام عقل

سے بالکلیہ آزاد ہو جائے تو کوئی توہم پرست یا دیومالائی مذہب وجود میں آ جاتا ہے، اور اگر عقل کو وحی پر مبنی عقائد وعبادات سے آزاد کر دیا جائے تو وہ کسی ایسے خشک سیکولر نظریئے کو جنم دے کر رک جاتی ہے جو مادے کے اس پار دیکھنے کی صلاحیت سے محروم ہوتا ہے۔ نتیجہ دونوں صورتوں میں محرومی ہے، کہیں جسم کے جائز تقاضوں سے، کہیں روح کے حقیقی مطالبات سے۔

جب سے سیکولرزم کے مقابلے کی ضرورت کے تحت اسلام کی سیاسی، معاشی اور معاشرتی تعلیمات پر ہمارے عہد کے مفکرین اور اہل قلم نے زیادہ زور دینا شروع کیا ہے، اس وقت سے بعض حضرات نے شعوری یا غیر شعوری طور پر عقائد وعبادات کو پس منظر میں ڈال کر انہیں ثانوی حیثیت دے دی ہے، اور انہیں وہ اہمیت دینا چھوڑ دیا ہے جو فی الواقعہ انہیں حاصل ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک ایک ''معاشی جانور''(Economic animal) ہو کر رہ گیا ہے، اور اس کی ساری دوڑ دھوپ اس جسم کو پالنے پوسنے کی حد تک محدود ہے جو ایک نہ ایک دن مٹی میں جانے والا ہے۔ اسے روحانی ترقی کے ان مدارج کی کوئی فکر نہیں جو درحقیقت انسان کو دوسرے جانوروں سے ممتاز کرتے ہیں، اور جن کی بدولت وہ مٹی میں ملنے کے باوجود بھی زندۂ جاوید رہتا ہے۔

جو لوگ مادی منافع اور نفسانی لذتوں ہی کو اپنا سب کچھ سمجھتے ہیں، ذرا ان کی اندرونی زندگی میں جھانک کر دیکھئے، وہ راحت اور آرام کے سارے اسباب وسائل اپنے پاس رکھنے کے باوجود ''سکونِ قلب'' کی دولت سے کتنے محروم ہیں؟ اس لیے کہ انہوں نے اپنے گرد وپیش میں جو دنیا بنائی ہے، وہ چاہے دنیا کے سارے خزانے لا کر ان کے قدموں میں ڈھیر کر سکتی ہو، لیکن قلب کو سکون اور روح کو قرار بخشنا اس کے بس کی بات نہیں، یہ خدا ناآشنا زندگی کا لازمی خاصہ ہے، کہ اس کے شیدائی ایک انجانی سی بے قراری کا شکار رہتے ہیں۔ اس بے قراری کا ایک کرب انگیز پہلو یہ ہے کہ انہیں یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ وہ بے قرار کیوں ہیں؟ وہ ہمہ وقت اپنے دل میں ایک نامعلوم اضطراب اور پراسرار کسک محسوس کرتے ہیں۔ لیکن یہ اضطراب کیوں ہے؟ کس لیے ہے؟ وہ نہیں

جانتے۔

انسان اس کائنات کا خالق و مالک نہیں، وہ کسی کی مخلوق ہے۔اس کا مقصد زندگی ہی یہ ہے کہ وہ کسی کی بندگی کرے۔اس لیے اس کی فطرت یہ چاہتی ہے کہ وہ کسی لافانی ہستی کے آگے سرنگوں ہو،اس کی عظمتوں پر اپنے عجز و نیاز کی پونجی نچھاور کرے،مصائب میں اس کے نام کا سہارا لے،اسے مدد کے لیے پکارے،اور زندگی کے مشکل ترین لمحات میں اس کی توفیق سے رہنمائی حاصل کرے۔آج کی مادہ پرست زندگی اسے خواہ دنیا کی ساری نعمتیں عطا کرسکتی ہو،لیکن اس کی فطری خواہش کی تسکین نہیں کرسکتی۔انسان کی یہ فطرت بعض اوقات نفسانی خواہشات کے انبار میں دب تو جاتی ہے،لیکن مٹتی نہیں،اور یہی وہ چھپی ہوئی فطری خواہش ہے جو اسے کیف ونشاط کے سارے وسائل مل جانے کے باوجود آرام نہیں لینے دیتی،اور بعض اوقات اس کی زندگی کو اجیرن بنا کر چھوڑتی ہے۔

یوں تو زندگی گزار رہا ہوں ترے بغیر
جیسے کوئی گناہ کئے جارہا ہوں میں

اسلام کی تعلیمات میں ''عبادات'' کا شعبہ اسی مقصد کے لیے رکھا گیا ہے کہ اگر ان پر ٹھیک ٹھیک عمل کرلیا جائے تو عبادات کے یہ طریقے انسانی کی روح کو حقیقی غذا فراہم کرکے اللہ تعالی کے ساتھ اس کے رشتے کو مضبوط اور مستحکم بناتے ہیں۔اور جسم وروح کے تقاضوں میں توازن پیدا کرکے انسان کو ایک ایسے نقطۂ اعتدال (Equilibrium) تک پہنچاتے ہیں جو درحقیقت سکون واطمینان کا دوسرا نام ہے،قرآن کریم کا ارشاد ہے:

(الا بذکر اللہ تطمئن القلوب) یادرکھو اللہ ہی کے ذکر سے دلوں کو اطمینان نصیب ہوتا ہے۔

رمضان کا مقدس مہینہ ہر سال اس لیے اتا ہے کہ سال کے گیارہ مہینے انسان اپنی مادی

مصرفیات میں اتنا منہمک رہتا ہے کہ وہی مصروفیات اس کی توجہ کا مرکز بن جاتی ہیں، اور اس کے دل پر روحانی اعمال سے غفلت کے پردے پڑنے لگتے ہیں۔ عام دنوں کا حال یہ ہے کہ چوبیس گھنٹے کی مصروفیات میں خالص عبادتوں کا حصہ عموما بہت کم ہوتا ہے، اور اس طرح انسان اپنے روحانی سفر میں جسمانی سفر کی بہ نسبت پیچھے رہ جاتا ہے۔ رمضان کا مہینہ اس لیے رکھا گیا ہے کہ اس مبارک مہینے میں وہ جسمانی غذا کی مقدار کم کر کے روحانی غذا میں اضافہ کردے اور اپنے جسمانی سفر کی رفتار ذرا دھیمی کر کے روحانی سفر کی رفتار بڑھادے، اور ایک مرتبہ پھر دونوں کا توازن درست کر کے اس نقطۂ اعتدال پر آجائے جو اس زندگی کی سب سے بڑی نعمت ہے۔ اور اگر ذرا غور سے دیکھیں تو اسی نقطۂ اعتدال پر پہنچنے کی مسرت ہے جس کا جشن ''عید الفطر'' کی صورت میں مقرر کیا گیا ہے۔

لہذا رمضان المبارک صرف روزے اور تراویح ہی کا نام نہیں ہے، بلکہ اس کا صحیح فائدہ اٹھانے کے لیے ضروری ہے کہ انسان اس مہینے میں نفلی عبادات کی طرف بھی خصوصی توجہ دے، اور کسی کی حق تلفی کئے بغیر اگر اپنے اوقات کو مادی مصروفیات سے فارغ کرسکتا ہے، تو انہیں فارغ کر کے زیادہ سے زیادہ نوافل، تلاوت اور ذکر و تسبیح میں صرف کرے۔

''کسی کی حق تلفی کئے بغیر'' میں نے اس لیے کہا کہ اگر کوئی شخص کہیں ملازم ہے تو ڈیوٹی کے اوقات میں اپنے فرائض منصبی چھوڑ کر نفلی عبادات میں مشغول ہونا شرعا جائز نہیں۔ البتہ اگر اس کے پاس اپنے فرائض منصبی سے متعلق کوئی کام نہیں ہے اور وہ خالی بیٹھا ہوا ہے تو بات دوسری ہے۔

لیکن کسی کی حق تلفی کئے بغیر بھی رمضان میں اپنی مادی مصروفیات ہر شخص کچھ نہ کچھ ضرور کم کرسکتا ہے۔ اور اپنے آپ کو ایسے مشاغل سے فارغ کرسکتا ہے جو یا تو غیر ضروری ہیں، یا انہیں مؤخر کیا جاسکتا ہے۔ اس طرح جو وقت ملے اسے نفلی عبادتوں، ذکر اور دعا میں صرف کرنا چاہئے۔

اس کے علاوہ جو بات سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ رمضان کے دن میں انسان جب روزے کی حالت میں ہوتا ہے تو وہ کھانا پینا چھوڑ دیتا ہے، یعنی اللہ تعالی کی بندگی کے تقاضے سے وہ چیزیں ترک کر دیتا ہے جو عام حالات میں اس کے لیے حلال تھیں۔ اب یہ کتنی ستم ظریفی کی بات ہوگی کہ انسان روزے کے تقاضے سے حلال کام تو ترک کر دے، لیکن وہ کام بدستور کرتا رہے جو عام حالات میں بھی حرام ہیں۔ لہذا اگر کھانا پینا چھوڑ دیا، مگر جھوٹ، غیبت، دلآزاری، رشوت ستانی وغیرہ جو ہر حالت میں حرام کام تھے، وہ نہ چھوڑے تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ایسا روزہ انسان کی روحانی ترقی میں کتنا مددگار ہو سکتا ہے؟

لہذا رمضان المبارک میں سب سے زیادہ اہتمام اس بات کا ہونا چاہئے کہ آنکھ، زبان، کان اور جسم کے تمام اعضاء ہر طرح کے گناہوں سے محفوظ رہیں، اپنے آپ کو اس بات کا عادی بنایا جائے کہ کوئی قدم اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں نہ اٹھے۔

رمضان کو آں حضرت ﷺ نے ''ایک دوسرے کی غمخواری کا مہینہ'' قرار دیا ہے۔ اس مہینے میں آپ ﷺ صدقہ وخیرات بھی بہت کثرت سے کیا کرتے تھے، اس لیے رمضان میں ہمیں بھی صدقہ وخیرات، دوسروں کی ہمدردی اور ایک دوسرے کی معاونت کا خصوصی اہتمام کرنا چاہئے۔

یہ صلح وصفای کا مہینہ ہے، لہذا اس میں جھگڑوں سے اجتناب کا بھی خاص حکم دیا گیا ہے۔ آن حضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ ''اگر کوئی شخص تم سے لڑائی کرنا چاہے تو اس سے کہہ دو کہ میں روزے سے ہوں''۔

خلاصہ یہ ہے ک رمضان صرف سحری اور افطاری کا نام نہیں، بلکہ ایک تربیتی کورس ہے جس سے ہر سال مسلمانوں کو گذارا جاتا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ انسان کا تعلق اپنے خالق ومالک کے ساتھ مضبوط ہو، اسے ہر معاملے میں اللہ تعالی سے رجوع کرنے کی عادت پڑے، وہ ریاضت اور مجاہدہ کے ذریعے اپنے اخلاق رذیلہ کو کچلے، اور اعلی اوصاف واخلاق اپنے اندر پیدا

کرے۔اس کے اندر نیکیوں کا شوق اور گناہوں سے پرہیز کا جذبہ بیدار ہو، اس کے دل میں خوف خدا اور فکر آخرت کی شمع روشن ہو جو اسے رات کی تاریکی اور جنگل کے ویرانے میں بھی غلط کاریوں سے محفوظ رکھ سکے۔اسی کا نام ''تقویٰ'' ہے، اور قرآن کریم نے اسی کو روزوں کا اصل مقصد قرار دیا ہے، ارشاد ہے:

(یایھا الذین آمنوا کتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم لعلکم تتقون)

اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کئے گئے ہیں، جیسے تم سے پہلے لوگوں پر فرض کئے گئے تھے، تاکہ تم میں تقوی پیدا ہو۔

جو شخص ''تقویٰ'' کے اس تربیتی کورس سے ٹھیک ٹھیک گذر جائے، اس کے بارے میں آں حضرت ﷺ نے یہ خوش خبری عطا فرمائی ہے کہ ''جس شخص کا رمضان سلامتی سے گذر جائے اس کا پورا سال سلامتی سے گذرے گا''۔

اس سے معلوم ہوا کہ رمضان ہمیں سال بھر کی سلامتی سے ہمکنار کرنے کے لیے آیا ہے، بشرطیکہ ہم سلامتی چاہتے ہوں، اور یہ سلامتی حاصل کرنے کے لیے اس ماہِ مقدس کا استقبال اور اکرام واعزار کرسکیں۔اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق دے۔آمین۔

☆☆☆

ایک عہد ساز شخصیت

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ

شام کے ایک بڑے ادیب اور سپریم کورٹ کے سابق جج سے ایک ریڈیو انٹرویو میں دریافت کیا گیا کہ آپ کا سب سے محبوب شہر کون سا ہے؟ تو انہوں نے کہا: میرا وطن دمشق، اس کے بعد میرے دوست مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا شہر لکھنؤ۔ اسی طرح عراق کے ایک بڑے عالم نے ایک ہندوستانی عہدہ دار کو بتایا کہ ہم ہندوستان کو لکھنؤ سے، اور لکھنؤ کو مولانا ابوالحسن علی ندوی کی وجہ سے پہچانتے ہیں۔ یہ اور اسی طرح کے دوسرے تاثرات جو عالم عربی میں سننے میں آئے، ان سے مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کی بین الاقوامی شخصیت کا پتہ چلتا ہے، مولاناؒ کی یہ شخصیت کیسے اور کیوں کر بنی؟ اسے جاننے کے لیے ہمیں مولاناؒ کی شخصیت کی تشکیل اور سیرت کی تعمیر میں کارفرما عوامل کو دیکھنے کی ضرورت ہے۔ ان عوامل میں سے ایک اہم عامل مولاناؒ کی گھریلو تعلیم وتربیت اور خاندانی ماحول ہے، جس میں ایک طرف دینداری، شریفانہ اقدار، نیک وصالح معاشرہ، اخلاق اور علم وادب سے خصوصی لگاؤ تھا، تو دوسری طرف غیر ملکی سامراج سے گلو خلاصی کی جدوجہد اور ملک کی آزادی کی خواہش وطلب تھی، جد امجد حکیم فخر الدین خیالیؒ شاعر وادیب، پدر بزرگوار حکیم سید عبدالحیؒ مورخ ناقد اور سیرت نگار، برادر بزرگ ڈاکٹر سید عبدالعلیؒ حکیم حاذق اور قدیم وجدید کے مجمع البحرین، والدۂ محترمہ صاحبۂ دیوان شاعری اور سوز وگداز کی حامل خاتون، ہمشیرہ مصنفہ اور مولفہ، اور پھر سب سے بڑھ کر جد اعلیٰ حضرت سید احمد شہیدؒ مرد مجاد اور رہبان باللیل وفرسان بالنہار کے زندہ شاہکار، غرض ایں خانہ ہمہ آفتاب است کی ایک منہ بولتی تصویر، اور پھر ان تمام خصوصیات کی جامع حضرت مولاناؒ کی ذات گرامی، اس طرح مولاناؒ کی شخصیت میں مختلف پہلو جمع ہو گئے تھے، وہ علم وادب کے خوشہ چیں، ہندوستانی سماج کی اعلیٰ

انسانی قدروں کے مطابق تشکیل کے لیے کوشاں، اور ملک کی تعمیر وترقی، ابنائے وطن کے مابین ہمدردی ورواداری اوراخوت وبھائی چارہ اورمسلمانوں کی اخلاقی وعلمی بلندی کے حریص تھے۔ انہوں نے وہ دور بھی دیکھا تھا جب ہندوستان غلام تھا جس سے سامراجی ظلم وچیرہ دستی کا ان کو اندازہ ہوا، اور ہندوستانی عوام کی زبوں حالی اور خاص طور پر مسلمانوں کی پسماندگی کا احساس ہوا جس سے مولاناؒ کے اندر آزادی اور خودمختاری کی قدر پیدا ہوئی، چناں چہ ملک کے آزاد ہونے پر انہوں نے اس کی بڑی ضرورت محسوس کی کہ ملک میں رہنے والے مختلف باشندے اپنی مذہبی اورانسانی قدروں کے مطابق ترقی کریں، اوراپنا اعلیٰ مقام بنائیں، مسلمانوں کوان کا جو مذہبی حق ہے اوران کا جو ملی تشخص ہے وہ ان کو پورا پورا ملے، اور ملکی معاملات میں وہ اور دوسرے مذاہب کے ماننے والے ہمدردی اور تعاون کی زندگی گزاریں، اس سلسلہ میں مولاناؒ نے جب عملی زندگی میں قدم رکھا تو ایک طرف انہوں نے تعلیم محاذ پر کام کیا، دوسری طرف اصلاح معاشرہ اور تہذیب اخلاق کے لیے کوشاں ہوئے، اللہ تعالی نے ان کو قلم اور زبان دونوں کی بلاغت اوراثر انگیزی عطا کی تھی، انہوں نے ان دونوں سے کام سے لیا اور تعلیم اوراصلاح کی لائن میں فائدہ پہونچایا، مولاناؒ کا تاریخ کا مطالعہ بہت اچھا تھا، اس کے ذریعہ مولاناؒ نے قوموں کے عروج وزوال اوران کے اسباب کو بہت اچھی طرح سمجھا تھا، اس سے انہوں نے بہت فائدہ اٹھایا، اس سلسلہ میں مولاناؒ نے صرف لکھنے اور بولنے پر اکتفاء نہیں کیا: بلکہ بااثر شخصیتوں سے مل کر انہیں ملت کی خدمت اور ملک کی ترقی کی طرف توجہ دلائی، اور پھر ملک وملت کی خدمت کرنے والوں کے ساتھ تعاون کیا، مولاناؒ کا طریقہ کار سنجیدہ اور سلجھا ہوا اور خیر خواہانہ تھا، اسی لیے وہ ملک کے مختلف الخیال قائدین کے نزدیک ایک مخلص اور خداترس انسان کی حیثیت رکھتے تھے۔ مولاناؒ ایک بڑے عالم دین بھی تھے اس لیے مسلمان علماء میں ان کو معزز مقام حاصل ہوا، اور جلد ہی مولاناؒ کو پورے عالم اسلام میں قدر ومحبت کی نظر سے دیکھا جانے لگا، مولاناؒ کا اصل وطن رائے

بریلی تھا،لیکن ان کی نشو ونما اور تعلیم کا زمانہ لکھنؤ میں گذرا، پھر عملی زندگی کا مرکز بھی لکھنؤ رہا،اس طرح لکھنؤ سے ان کو نسبت حاصل رہی۔

مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ نے مسلمانوں کے ملی،تعلیمی اور دینی معاملات میں جو مفکرانہ اور قائدانہ دلچسپی لی اور ان کی اس دلچسپی سے امت کو جو فائدہ پہونچا، اس سے سب دانشور مسلمان واقف ہیں، انہوں نے امت اسلامیہ کے معاملہ سے خصوصی دلچسپی لینے کے ساتھ ساتھ ملک کی بھی صلاح وفلاح کی فکر کی ،مسلمانوں کے دائرہ میں ان کی خصوصی توجہات،ان کی تعلیم، ان کے کردار، پھر ان کی شریعت کی حفاظت کے مسائل پر خاص طور پر مرکوز رہیں، مسلمانوں کی تعلیم کے سلسلہ میں دارالعلوم ندوۃ العلماء ان کا اصل میدان فکر وعمل بنا، جو ایک صدی قبل قدیم صالح اور جدید نافع کی بنیاد پر قائم ہوا تھا،اس کو گذشتہ چالیس سال میں مولاناؒ نے اپنی سربراہی میں اسلامی تعلیم کے ایک مشہور ومقبول بین الاقوامی ادارہ کی حیثیت تک پہونچادیا۔اوراس سیکولر وہندو اکثریت کے ملک میں مسلمان بچوں کی دینی بنیاد کو ان کی ابتدائی تعلیم کے زمانہ ہی میں مضبوط کرنے کے لیے دینی تعلیمی کونسل کے ذریعہ جو نظام قائم ہوا،اس کی بھی پوری سرپرستی فرمائی،اور تاحیات صدر رہے۔

شریعت اسلامیہ کی حفاظت کے سلسلے میں تحفظ شریعت کی اس عظیم تحریک میں حصہ لیا جو آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے تحت ملک میں چلائی گئی،اور حضرت مولانا قاری طیب صاحبؒ کی وفات کے بعد آپ اس کے صدر منتخب کیے گئے اور زندگی کی آخری سانس تک اس عہدہ پر فائز رہے،اوراس کے مسئلوں کے حل میں کلیدی کردار انجام دیا، پھر برصغیر کے باہر کے مسلمان ملکوں اور مسلمان سوسائٹیوں کی خیرخواہی کا حق بھی ادا کیا اور مدد پہونچائی۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو ملت اسلامیہ کی فکر کے ساتھ ساتھ پوری انسانیت کی خیرخواہی وخیرطلبی کی فکر بھی رہی،اوراس کے لیے انہوں نے پیام انسانیت کی تحریک چلائی،جس میں تمام مذاہب

کے خیر پسند لوگوں کو بھی شریک کرتے، اور ملک وقوم کی بھلائی کی طرف توجہ دلاتے، اس طرح مولاناؒ نے ملی، ملکی، و بین الاقوامی تینوں دائروں کو اپنا دائرۂ کار بنایا، اور نمایاں خدمات پر سب سے خراج تحسین حاصل کیا۔

وہ جہاں جس تعاون کا تقاضہ سمجھتے اس کے کرنے کی کوشش کرتے، اور جہاں کمزوری اور انحراف محسوس کرتے، وہاں اصلاح وتنقید کی اپنی آواز پہونچاتے، اور صحیح اسلام اور ملت کی صحیح پاسداری کی طرف توجہ دلانے کا جرأت مندانہ کام انجام دیتے تھے، اس کے لیے عوام میں عمومی خطاب کا، اور حکومت کے ذمہ داروں کے لیے ملاقات وافہام وتفہیم کا طریقہ اختیار کرتے، مولاناؒ نے دینی وملی خدمت کے لیے اپنا جو مزاج بنایا تھا، اس میں مخاطب کے لیے اس کے مقام وحیثیت کے لحاظ سے جو اسلوبِ کلام مناسب ہوتا اور اس کا جو اچھا کام ہوتا، اس کے لحاظ اور اس کے اعتراف کے ساتھ بات کرتے، تنقید ہوتی، لیکن انداز محبانہ ومشفقانہ ہوتا، چناں چہ ان کی تلخ بات بھی برداشت کرلی جاتی، اس سلسلہ میں ان کو اپنے ملک کی چوٹی کے لیڈروں سے اور غیر ممالک کے سربراہانِ مملک سے بات کرنے کے جو مواقع حاصل ہوئے انہوں نے ان مواقع سے فائدہ اٹھایا، اور استغناء کے ساتھ اور یہ محسوس کراتے ہوئے بات کی کہ ان کی کوئی مادی غرض نہیں ہے، اور یہ محض خیر خواہی میں ہے، اس کی تھوڑی بہت تفصیل ان کی خودنوشت سوانح اور ان کے مضامین وسفرناموں میں دیکھی جاسکتی ہے۔

علمی وفکری لائن میں مولاناؒ کی مؤقر اور اثر انگیز تصنیفات منظر عام پر آئیں، جن کی شہرت عام طور پر صرف برصغیر ہی میں نہیں، بلکہ پورے عالم اسلام میں ہوئی، ان میں سے کئی تصنیفات نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھی گئی، اور ان میں سے بعض کو پوری صدی کی منتخب واہم ترین تین چار کتب میں سے ایک شمار کیا گیا۔

ادبی پہلو کے لحاظ سے مولاناؒ نے ادب کو زندگی کے لیے مفید اور انسانی واسلامی فائدے

کے حصول میں ایک معاون کے طور پر پیش کیا، اور اس کی حیثیت کو عالم اسلام سے منوایا، جس کے اثر سے رابطہ ادب اسلامی عالمی انجمن وجود میں آئی، جس کے وہ تاحیات صدر قرار پائے، اس کا صدر دفتر خود مولاناؒ کے مستقر ندوۃ العلماء لکھنؤ میں ہے۔ اس سلسلہ میں مولاناؒ کا کام صرف نظری اور تحریکی ہی نہیں رہا، بلکہ خود مولاناؒ کے قلم نے ادب کے ایسے شہ پارے پیش کیے جوان کے ادبی نقطہ نظر کے عملی نمونے ہیں۔

مولاناؒ کی فکری ونظریاتی خصوصیات میں اصلاح باطن وتزکیۂ نفس کی خصوصی آمیزش تھی، جوان کے عہد کے عامل بالسنہ بزرگوں سے ربط اور تزکیۂ باطن کے حاملین سے تعلق واستفادہ کے اثر سے پیدا ہوا تھا، مولاناؒ کے اس پہلو نے ان میں زہد فی الدنیا، استغناء وقناعت اور تصور آخرت کے غلبہ جیسی صفات پیدا کیں، جن کے اثر سے مولاناؒ کے تعلق والوں میں مولانا سے محبت وعقیدت میں اضافہ ہوا، اور کام میں اثر پذیری بڑھی، اور اس طرح ان کے کاموں اور کوششوں کو قبولیت حاصل ہوئی۔

مولاناؒ کے کاموں کا دائرۂ کار اتنا وسیع اور متنوع تھا، اور ان کی فکرمندی ملت اسلامیہ اور قوم ووطن کے مفاد میں اتنے پہلوؤں میں تھی کہ ایک شخص میں وہ شاذ ونادر جمع ہوتی ہے، اسی لیے مولاناؒ کی رحلت کو ملت اسلامیہ کے ہر طبقہ اور جماعت بڑا سانحہ سمجھا، اور اس کو صرف امت اسلامیہ ہی نہیں، بلکہ ملک ووطن کے دیگر بہی خواہوں نے بھی خسارہ سمجھا، اور اظہار افسوس کیا، اور اس کو ایسا خلا قرار دیا جس کے آسانی سے پر ہوجانے کی توقع نہیں ہے، مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے دین وعلم اور ملک وملت کے لیے جو فکر وجد وجہد کی، ان کے قدردانوں کا فرض ہے کہ اس کو جاری رکھنے کی فکر کریں۔ مولاناؒ جیسی شخصیات خال خال ہی پیدا ہوتی ہیں، شاد عظیم آبادی نے خوب کہا ہے:

ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم

☆☆☆

فقہ و فتاویٰ

حضرت مولانا مفتی احمد صاحب خان پوری دامت برکاتہم

کھانا کھلانے کی نذر میں پیسے بھی دے سکتے ہیں

سوال: ایک شخص نے نیت کی کہ میرا بھائی انگلینڈ جائے، اور ویزا مل جائے تو ۱۰۰۰ روپے کا کھانا غرباء کو کھلاؤں گا۔ اگر وہ کھلانے کے بجائے غرباء میں رقم تقسیم کردے تو درست ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

رقم تقسیم کردے گا تب بھی نذر پوری ہوجائے گی۔ (شامی ۲/۷۰) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

بیرون ملک بلانے کے لیے غلط بیانی کرنے والے کے لیے شرعی حکم

سوال: ۱۹۶۷ء میں میرے بڑے بھائی کے لڑکے کو میں نے بیٹے کے طور پر یو۔ کے۔ بلایا، اپنی اولاد کی طرح عصری تعلیم جی۔سی تک دلائی، اس کی پرورش کی، جب وہ جوان ہوا، کام کرنے کے لائق ہوگیا، تو ہمارے ایک دوسرے بھائی (جولندن میں رہتے تھے، ان) کی لڑکی کے ساتھ نکاح کرایا۔ ان سب کے باوجود وہ مجھ سے تعلقات برقرار رکھنا نہیں چاہتا۔ اب سوال یہ ہے کہ میں نے بیٹے کے طور پر بلایا، غلط بیانی بھیجی، غلط حلف نامہ بھیجا، جس کا کفارہ اور فدیہ اس سے لے سکتے ہیں یا نہیں؟ اگر لے سکتے ہیں تو کتنا؟ غریب طلبہ اور مسکین لوگوں کو دینے سے اللہ تعالیٰ گناہ معاف کرتا ہے، اس کو مفصل بتلائیں۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً: اگر کسی گذشتہ واقعے پر جان بوجھ کر جھوٹی قسم کھائے، اس کو اصطلاحِ فقہاء میں ''یمین غموس'' کہتے ہیں۔ یہ جھوٹی قسم گناہِ کبیرہ اور موجبِ وبالِ دنیا وآخرت ہے۔ مگر اس پر کوئی کفارہ واجب نہیں ہوتا، توبہ واستغفار لازم ہے، اسی لیے اس کو اصطلاح فقہاء میں یمین غموس کہا جاتا ہے، کیوں کہ غموس کے معنی ڈُبا دینے والے کے ہیں،

یہ قسم انسان کو گناہ اور وبال میں غرق کر دینے والی ہے۔(معارف القرآن ۳/۲۲۲ سے ماخوذ)

مشکوٰۃ شریف میں بخاری اور مسلم کے حوالے سے ایک روایت منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ کبیرہ گناہ: اللہ تعالی کے ساتھ شرک کرنا، ماں باپ کی نافرمانی کرنا، ان کے ساتھ قطع تعلق کرنا، کسی کو ناحق قتل کرنا، اور یمین غموس ہے۔(مشکوٰۃ/ ۱۷)

آپ نے اپنے بھتیجے کا غلط حلف نامہ بھجوا کر بہ طور بیٹے بلایا، آپ کی وہ قسم شرعاً یمین غموس شمار ہوگی، جو گناہ کبیرہ ہے۔ نیز آپ کے حلف نامے کی بنیاد پر اس وقت سے لے کر آج تک سرکاری کاغذات میں اس لڑکے کے باپ کے طور پر آپ ہی کا نام رہا ہوگا، یہ بھی سخت گناہ ہونے کی وجہ سے حدیث شریف میں اس سلسلے میں وعیدیں وارد ہوئی ہیں:

بخاری شریف میں نبی کریم ﷺ کا ارشاد منقول ہے کہ جو شخص اپنے حقیقی باپ کے علاوہ کسی دوسرے سے اپنا نسب ثابت کرے (یعنی اس کو اپنا باپ بتلائے) حالاں کہ اسے معلوم ہے کہ فی الحقیقۃ کوئی دوسرا شخص اس کا باپ ہے، تو اس شخص پر جنت حرام ہے۔(بخاری شریف ۲/ ۱۰۰۱)

لہذا آپ کا وہ بھتیجا بھی سخت گنہگار، بلکہ گناہِ کبیرہ میں ملوث ہے۔ نیز ایسا برا کام کرنے کے لیے جن لوگوں نے آپ پر دباؤ ڈالا (یعنی بڑے بھائی اور اماں صاحبہ) وہ بھی گنہ گار ہیں لہذا ہر ایک کو اپنے گناہ سے سچی پکی توبہ اور استغفار کرنا ضروری ہے۔ آپ خود اپنے اس گناہ سے توبہ واستغفار کرنے کے ساتھ ساتھ دیگر حضرات جو اس قصے میں شریک رہے، انہیں بھی اطلاع کر کے ان کو بھی توبہ واستغفار کی تاکید کریں۔ یہ بات ذہن نشیں رہے کہ ہر وہ گناہ جس میں اللہ تعالی کی نافرنی ہوتی ہو، اس میں کسی کے بھی دباؤ میں آ کر اس پر عمل پیرا ہونا جائز نہیں ہے۔(چاہے وہ ماں باپ کی طرف سے ہی کیوں نہ ہو) اور اس کے جو نتائج آپ دیکھ رہے ہیں، وہ درحقیقت اللہ تعالی کی نافرمانی کا نتیجہ ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

میٹر بند کرنے کا گناہ وایرمین کے سر یا بند کرانے والے کے؟

سوال: ہمارے گاؤں میں ایک مسلمان وائرمین ہے، وائرنگ کا کام کرتا ہے، لیکن لوگ اسے اپنا میٹر بند کروانے کو کہتے ہیں، وہ وائرمین میٹر بند تو کر دیتا ہے، لیکن وہ کہتا ہے کہ اس کا گناہ تمہارے (میٹر بند کرانے والے کے) سر ہوگا۔ تو گناہ کس کو ہوگا؟ مفصل جواب مرحمت فرمائیں۔ اور اگر وائرمین میٹر بند کرنا دوسرے کو سکھائے تو اس کا گناہ کس کو ہوگا؟ بتلانے والے کو یا بند کرانے والے کو؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً: وایرمین سے میٹر بند کرانے کا مقصد اگر بجلی چوری ہے، تو ظاہر ہے کہ یہ گناہ ہے، اس طور پر بجلی استعمال کر کے بجلی گھر کو اس کی قیمت ادا نہ کرنا، اور بجلی گھر والوں کو دھوکہ دینے میں چوری کے ساتھ دھوکہ بازی بھی ہے، اور یہ سخت گناہ ہے۔ اب جو لوگ یہ کام کرواتے ہیں، وہ تو گنہگار ہیں ہی، اور وایرمین ان کی معاونت کر کے گناہ میں شریک ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالی ارشاد فرماتے ہیں: ''گناہ اور نافرمانی (کے کاموں) میں معاونت نہ کرو'' لہذا صورتِ مسئولہ میں دونوں گنہ گار قرار پائیں گے۔ چوری کرانے والے کو چوری اور دھوکہ بازی کا گناہ ہوگا، اور وایرمین کو اس میں معاونت کا۔ وایرمین صرف یہ کہہ دینے سے کہ ''اس کا گناہ تمہارے ذمے! بری الذمہ نہ ہوگا، ہر ایک کو اپنا اپنا گناہ ہوگا۔ قرآن پاک میں اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ''کوئی شخص کسی دوسرے شخص کے گناہ کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا''۔

اگر وایرمین میٹر بند کرنے کا کام دوسرے کو اس مقصد سے سکھلاتا ہے کہ یہ بھی بجلی کام کے ہنر کا ایک حصہ ہے، تو وایرمین گنہ گار نہیں ہوگا، اور اگر بجلی چوری کرنے کی ترکیب کے طور پر سکھائے، تو گنہ گار ہوگا۔ اس صورت میں میٹر بند کرنے کا اصل گنہ گار بند کرنے والا ہی ہوگا،

البتہ وارثین کو اپنے فعل کا گناہ ہوگا۔فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

مرمت کی اشیاء گاہک واپس لینے نہ آئے تو مرمت کرنے والا کیا کرے؟

سوال: ہماری دکان ''نڈیاد'' میں ہے،جس میں تھرموس،الیکٹرک ٹارچ، پریس،تھرموس بیگ،اسٹووغیرہ اشیاء(نئی) بیچی جاتی ہیں،اس کے ساتھ ساتھ ان ہی اشیاء کی مرمت کا کام بھی ہوتا ہے۔ بہت سے گاہک ہمارے پاس اپنی چیزیں مرمت کرانے کے بعد واپس لے جاتے ہیں، جب کہ بعض گاہک اپنی چیزیں مہینوں اور سالوں کے بعد بھی واپس نہیں لے جاتے۔ایسی چیزوں کا ہمارے یہاں ڈھیر ہوگیا ہے۔ہم گاہکوں کا صرف نام لکھتے ہیں، پتے نہیں لکھتے،تاکہ ہم ان کے پتے پر وہ چیزیں واپس لوٹاسکیں۔ان چیزوں میں نئے اجزاء ڈالنے کے بعد ہماری محنت بھی اس پر صرف ہوئی ہے، نیز ہماری پونجی بھی اس میں شامل ہے،اور ہماری دکان میں ان چیزوں کے رکھنے کی جگہ بھی نہیں ہے۔لہذا ہم نے ایسی چیزیں اپنے گھر کے ایک کمرے میں رکھ دی ہیں۔اب پریشانی یہ ہے کہ ہم اس کمرے کا استعمال کسی دوسرے کام میں نہیں کرسکتے۔ہم ایسی چیزوں کا کیا کریں؟ ہماری محنت کا کیا؟ نیز اس میں صرف شدہ پونجی کا کیا؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

آپ اولاً اپنے اس مقامی اخبار میں جو زیادہ پڑھا جاتا ہو،ایک اشتہار اس طرح دے دیں کہ جن لوگوں نے ہمارے یہاں اپنی چیزیں (تھرموس، الیکٹرک ٹارچ، پریس، اسٹو وغیرہ) مرمت کے لیے دی ہیں،اور اتنا وقت گذرنے کے بعد بھی اب تک واپس نہیں لے گئے؟ انہیں اس اشتہار کے ذریعے اطلاع دی جاتی ہے کہ ۳۰/دن کے اندر اندر اپنی اشیاء لے جائیں۔اگر

نہیں لے گئے تو ہم وہ چیزیں بیچ دیں گے۔اس کے بعد بھی اگر کوئی لینے نہ آئے تو آپ ان اشیاء کوفروخت کر کے اس کی جو قیمت آئے، اس میں سے اپنا محنتانہ اوراجزاء وغیرہ کی قیمت نکال کر بقیہ رقم کوغریبوں میں صدقہ کردیں۔(شامی۳/۳۵۳)

البتہ اس مدت کے بعد اگر مالک آ کر اپنی چیز کا مطالبہ کرے،تو آپ اسے بتلادیں کہ ہم نے اتنے عرصے تک آپ کا انتظار کیا، آپ کے نہ آنے پر ہم نے اخبار میں اشتہار بھی دیا، پھر ہم نے وہ چیز فروخت کردی، اس میں سے ہمارا محنتانہ وغیرہ نکال کر بقیہ رقم کا آپ کی طرف سے صدقہ کردیا ہے۔اگر وہ شخص اسے منظور کرلے تو ٹھیک ہے، اوراگر وہ منظور نہ کرے تو جتنی رقم کا صدقہ کیا ہے، اتنی رقم آپ اسے لوٹادیں۔اس صورت میں رقم کے صدقے کا ثواب آپ کو ملے گا۔آپ کی دکان کے کارندوں میں اگر کوئی غریب ہو،تو بقیہ رقم بہ طورِصدقہ اسے بھی دے سکتے ہیں۔(شامی)

ایک بات یادرہے کہ اخبار میں دیے گئے اشتہار کا خرچ آپ کو بہ ذات خود برداشت کرنا ہوگا، اورآئندہ چل کرآپ فقط نام لکھنے کے بہ جائے مکمل پتہ لکھنے کا اہتمام کریں، تاکہ مالک تک اس کی چیز پہنچانے کا فریضہ بحسن وخوبی انجام پاسکے۔فقط واللہ تعالیٰ أعلم۔

مسجد بنانے کے ارادے سے خریدی ہوئی زمین میں ردوبدل

سوال: ہم نے آج سے تقریباً ۲؍سال قبل بھگتی نگر میں مسجد بنانے کے ارادے سے ایک زمین خریدی تھی، اب تک اس پر کسی قسم کا تعمیری کام نہیں ہوا، فی الحال ہمارا ارادہ اس جگہ مسجد بنانے کے بہ جائے ہمارے یہاں مدرسے کے قریب ایک جگہ میں مسجد بنانے کا ہے، تاکہ مسجد اور مدرسہ ایک ساتھ رہیں۔اور مدرسے کے پڑوس کی جگہ مسجد یا مدرسے کی نہیں ہے، بلکہ اسے خریدنے کا ارادہ ہے۔تو کیا اس طرح ردوبدل کرسکتے ہیں؟ ایک جگہ مسجد بنانے کے ارادے

سے خریدی ہوئی، اسے ترک کر کے دوسری جگہ مسجد بنا سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

لوگوں سے مسجد کے لیے زمین خریدنے کے نام پر چندہ وصول کر کے مذکورہ زمین خریدی ہے، تو اب اس میں ردوبدل نہیں کر سکتے۔ اور اگر کسی شخص نے اپنے ذاتی پیسوں سے اس زمین کو خریدا تھا، اور خریدتے وقت مسجد بنانے کی نیت کی تھی، لیکن ابھی تک زمین سپرد نہیں کی، بلکہ اپنے پاس ہی رکھ چھوڑی، اور اس کے بہ جائے دوسری زمین مانگے تو دے سکتا ہے۔ (شامی ۳/۴۰۵) فقط واللہ تعالیٰ أعلم۔

قرض کی ادائیگی کے لیے وقف کی زمین نہیں بیچی جاسکتی

سوال: ایک زمین پر اساتذہ کے لیے مسجد کے تحت گھر بنائے گئے ہیں، گھر تیار ہو چکے ہیں، لیکن بیرون ملک سے جو رقم آنے والی تھی وہ مکمل نہیں آئی، بلکہ آدھی رقم آئی ہے، بقیہ قرض ہے۔ اس کی ادائیگی جماعت کی ایک زمین فروخت کر کے کی جاسکتی ہے یا نہیں براہِ کرم مفصل بتلائیں۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

شاید جماعت کی زمین ہمارے یہاں کے رواج کے مطابق وقف ہی ہوگی، اور وقف کی زمین کا فروخت کرنا شرعاً ناجائز ہے۔ لہذا آپ اس زمین کو فروخت کر کے سوال میں مذکور قرض کی ادائیگی نہیں کر سکتے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم۔

وقف پر کرایہ دار بالجبر قبضہ جمالیں تو ٹرسٹی کیا کریں؟

سوال: ٹرسٹ کی ملکیت کے سلسلے میں تفصیل بتلاتا ہوں، اس سے پیدا ہونے والے سوالات میں شریعت کا کیا حکم ہوگا؟ تفصیل بتلائیں۔

ٹرسٹ کی ملکیت تقریباً ۹۰/ سے ۱۰۰/ برس پرانی مسجد اور اس کے ساتھ ایک حصہ ۷۵×۴۵ ہے۔فی الحال اس کے آگے کے حصے میں تین دکانیں ہیں،اوراس کے کرایہ دار تقریباً ۴۰/سال پرانے ہیں، بہ ظاہر دین دار ہیں۔مسجد کے پیچھے کا حصہ کمزور ہو چکا ہے،جس کی مرمت کا خرچ تقریباً ۱/لاکھ روپے ہے۔ پیچھے والے حصے میں اوپر کا منزلہ مسجد کے کام آتا ہے، اور نیچے گوڈاؤن ہے جو کرایہ دار کے قبضے میں ہے، غیر مستعمل ہے۔ٹرسٹی حضرات اس پوری ملکیت کو منہدم کر کے از سرِ نو رمرمت کروانا چاہتے ہیں،اوراس سلسلے میں جس کرایہ دار کے حصے میں زمین کا جتنا ٹکڑا ہے،اسی کے بقدر کسی قسم کا تعمیری خرچ لیے بغیر، نیز کرایہ دار کے کرایے میں اضافہ کیے بغیر تعمیری کام کے بعد انہیں وہ حصہ ملے گا۔کرایہ دار نمبر-۲ جس کے قبضے میں گوڈاؤن ہے،جس کی لمبائی چوڑائی ۲۴×۴۵ ہے، وہ بھی غیر مستعمل ہے، وہ ٹرسٹی حضرات اپنے قبضے میں لے لیں گے۔اس طرح مذکورہ جگہ میں تہ خانہ اور گراؤنڈ فلور پر دکانیں ہوں گی، نیز دکان کے پیچھے کے حصے میں مصلی حضرات اور تبلیغی جماعت کو زیادہ سہولت ہوگی۔اوراس ملکیت سے مسجد کی آمدنی بھی ہوسکتی ہے۔مذکورہ ملکیت کا بقیہ حصہ بھی پائدار نہیں،اور خدانہ خواستہ اگر وہ ملکیت گر جائے گی تو کسی کی جان کا خطرہ ہے، اس طرح دنیوی اصول وقوانین کے مطابق ٹرسٹی حضرات اس کے ذمہ دار ہیں۔اس سلسلے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟

(۱) کرایہ دار کا بالجبر قبضہ کرنا اور خیانت کرنا۔

(۲) للہ ملکیت کا اس طرح غلط فائدہ اٹھا کر ٹرسٹ کو پریشانی میں ڈالنا۔

(۳) ٹرسٹی حضرات قانونی طور پر اقدام کریں،تو فتنہ اور دشمنی پیدا ہوتی ہے،تو ٹرسٹیوں کو کیا کرنا چاہئے؟

(۴) ناجائز قبضہ جمانے والوں کے خلاف اقدام کرنے سے ٹرسٹی حضرات کو نجی عداوت کا

سامنا کرنا پڑتا ہے،تو کیا ٹرسٹیوں کو استعفیٰ دے دینا چاہئے۔

مذکورہ سوالات کا مفصل جواب مرحمت فرمائیں۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اسلامی فقہ میں وقف کے مسائل کے لیے مستقل باب قائم کر کے الگ الگ فصلوں میں اس پر مفصل بحث کی گئی ہے۔وقف سے متعلق شریعت نے جو احکامات بتلائے ہیں ان کا اصل مقصد یہ ہے کہ وقف کی ملکیت کو کسی قسم کا نقصان پہنچائے بغیر جس مقصد کی خاطر اس ملکیت کو وقف کیا گیا ہے،اس میں اس کا زیادہ سے زیادہ بہ حسن وخوبی استعمال ہو۔نیز وہی ملکیت زیادہ سے زیادہ محفوظ رہے۔مثال کے طور پر کچھ مسائل پیش کرتا ہوں:

(۱) وقف کی ملکیت کو یکبارگی لمبے عرصے کے لیے کرایے پر دینا منع ہے۔اگر مکان یا دکان ہو تو ایک سال کی مدت پر،اور قابل کاشت زمین ہو تو ۳ رسال کی مدت پر یکبارگی کرایے پر دے سکتے ہیں،اس سے زیادہ مدت کے لیے نہیں۔اور اگر اس سے زیادہ مدت کے لیے ہی کرایے پر دینا مناسب معلوم ہوتا ہو،تو شرعی قاضی کی اجازت لے کر دی جاسکتی ہے۔(دیکھئے! درمختار شامی ۳/ ۴۳۵)

اس کی وجہ یہی ہے کہ لمبے عرصے تک یکبارگی کرایے پر دینے کی صورت میں کرایہ دار کی جانب سے اس پر قبضہ جما کر ملکیت کے دعوے کا اندیشہ ہوتا ہے۔

(۲) ٹرسٹیوں کے لیے ضروری ہے کہ وقف کی ملکیت کو بازار کی قیمت کے مطابق کرایے پر دیں۔(یعنی اس ملکیت کا مروجہ طریقے پر بازار میں جو کرایہ رائج ہے،اسی کے مطابق کرایہ طے کریں)اس سے کم قیمت میں کرایے پر دینا جائز نہیں۔حتیٰ کہ جو شخص کرایے پر دے رہا ہے، چاہے وہی اس سے فائدہ اٹھانے والا کیوں نہ ہو۔مثلاً: کسی شخص نے اپنا مکان وقف کیا،اور اس

کی آمدنی اپنی اولاد کے لیے وقف کی، اور اولاد میں ایک ہی شخص رہ گیا ہے، اور وہی بطور ٹرسٹ ذمہ داری نبھا رہا ہے۔ اب وہی ٹرسٹی خود مکان کے کرایے کا حق دار ہے، اور اسی کو کرایے سے فائدہ اٹھانا ہے، تب بھی اس کے لیے وقف کے مکان کو بازار میں رائج کرایے سے کم کرایے میں دینا جائز نہیں ہے، اس لیے کہ فی الحال تو وہ اس کرایے سے فائدہ اٹھا رہا ہے، لیکن مستقبل میں وقف کی ملکیت کو نقصان ہے۔ (دیکھئے! درمختار شامی ۳/ ۴۳۶)

اس عبارت میں وقف کی ملکیت کو نقصان ہو رہا تھا، اس لیے کم کرایے پر دینے سے ممانعت فرمائی گئی۔ حالاں کہ ٹرسٹی کے اس اقدام سے فی الحال اسی کو نقصان ہو رہا تھا۔

(۳) وقف کی جائداد بازار میں رائج قیمت پر ایک سال کے لیے کرایے پر دے دی گئی، اس کے بعد بازار کی قیمت میں اضافہ ہوا، اور اس جائداد کا بازاری کرایہ بڑھ گیا، تو ٹرسٹی کے لیے ضروری ہے کہ جس کرایے دار کو وہ ملکیت کرایے پر دی ہے اس کے ساتھ کرایے کے معاملے کو فسخ کر کے نئی قیمت کے مطابق کرایہ بڑھا کر نیا قرار کرے۔ اور اگر وہ کرایہ دار نئی قیمت کے مطابق کرایہ دینے کے لیے تیار نہ ہو، تو خود دوسرے کسی شخص کو جو وہ قیمت دینے کے لیے تیار ہو، اس کو دے۔ (دیکھئے! درمختار شامی ۳/ ۴۳۷)

اس مسئلے میں کرایے کا قرار ہو چکا ہے، ملکیت ایک مقررہ وقت کے لیے کرایے پر دی جا چکی ہے، اس کے باوجود بازار میں کرایے میں اضافہ ہونے کی وجہ سے طے شدہ قرار کو باقی رکھنے میں وقف کی ملکیت کو نقصان ہو رہا تھا، اس لیے ٹرسٹیوں کو یہ حکم دیا گیا کہ نئی قیمت کے مطابق از سرِ نو کرایے کا معاملہ کریں، اور اس کے لیے سابقہ کرایہ دار آمادہ نہ ہو تو کسی اور شخص کو کرایے پر دیں۔

مذکورہ تینوں مسائل میں بہ طور نمونہ پیش کیے ہیں۔ ان کے پیش کرنے کا مقصد صرف یہی

ہے کہ وقف کی ملکیت کے سلسلے میں اسلامی نظریہ واضح ہوجائے۔اب آپ کے سوالات کے جوابات دیے جاتے ہیں۔

(۱،۲) وقف کی ملکیت کی دکان اور گوڈاؤن پر کرایہ دار کا سرکاری قانون کا فائدہ اٹھا کر قبضہ جمانا،اوران کا باقاعدہ رائج کرایہ ادانہ کرنا،اور پُرانے کرایے کو برقرار رکھنا،اورٹرسٹیوں کو پریشانی میں ڈالنا گناہ ہے۔اور وقف کی ملکیت کواس طرح ہڑپ کرنا،شرعاً غصب ہی کہلائے گا۔فقہاء نے وقف کی ملکیت کو ہڑپ کرنے کوبھی یتیم کے مال کو ہڑپ کرنے ہی کی طرح شمار کروایا ہے، اور یتیم کے مال کو ناحق ہڑپ کرنے والوں کے لیے قرآن وحدیث میں سخت وعیدیں وارد ہوئی ہیں۔ یہ دنیوی زندگی عارضی ہے،ایک دن موت آنی ہی ہے،اوراللہ تعالی کے حضورپیش ہوکراپنے تمام اعمال کا حساب وکتاب دینا ہے۔جولوگ وقف کی ملکیتوں پراس طرح ناجائز قبضہ جمارہے ہیں،اور باقاعدہ رائج کرایہ ادانہ کرکے اس کو ہڑپ کررہے ہیں، انہیں غورکرلیناچاہئے کہ کل قیامت کے دن کیاجواب دیں گے۔''وسیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون''(الشعراء:۲۲۷)(عنقریب انہیں معلوم ہوجائے گا جنہوں نے(اللہ تعالی اور بندوں کے حقوق میں)ظلم کررکھا ہے کہ کیسی(تکلیف دہ)جگہ پرانہیں لوٹنا ہے۔

(۳)ٹرسٹیوں کی ذمہ داری ہے کہ اس سلسلے میں قانونی کارروائی کرکے وقف کی ملکیت کی حفاظت کریں۔البتہ اس کے لیے اگرضروری معلوم ہوتو پہلے جنرل میٹنگ کرے، محلے کے تمام لوگوں کوجمع کرکے ٹرسٹ کی ملکیت کو ہونے والے نقصانات کی تفصیلات ان کے سامنے پیش کرے،حفاظت کے طریقوں کے سلسلے میں تمام مل کرغوروفکر کریں،اور محلے کے تمام لوگوں کی معاونت حاصل کرکے اقدام کریں،تاکہ فتنہ نہ ہو۔ فتنے کا خدشہ تواسی وقت ہوتا ہے جب لوگوں کے سامنے حقیقت نہیں ہوتی،مذکورہ طریقہ اپنانے سےان شاءاللہ فتنے کا خطرہ دور ہوگا۔

(۴) رہ گیا مسئلہ نجی عداوت کا، تو اس عظیم مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ٹرسٹی حضرات اتنی تکلیف برداشت کرلیں گے تو ان کا یہ قدم محض اللہ کی خاطر ہوگا۔ ان کی اس قربانی کی قدر اللہ تعالی کے دربار میں خوب ہوگی، اور وہ اجر عظیم کے حق دار ہوں گے۔ آج کل ہم خانگی فوائد کے لیے عداوتیں برداشت کرتے ہیں، تو اللہ تعالی کے لیے برداشت کی ہوئی یہ عداوت ان شاء اللہ تمام عداوتوں کا کفارہ ہوجائے گی۔ ایسی عداوتوں سے خوف کھا کر اگر استعفیٰ دے دیں گے تو دین کا کام کرے گا کون؟ ہمت اور حوصلے سے کام لے کر اپنی ذمہ داری بجالاتے رہیں۔ اللہ تعالیٰ کی خصوصی مدد آپ کے ساتھ ہے۔ یہ بات مدنظر رہے کہ ان کی نجی عداوت کے جواب کے طور پر آپ لوگ نجی عداوت کی آگ میں کود نہ پڑیں، البتہ اگر نجی عداوتیں شدت اختیار کر کے آپ کے لیے ناقابل برداشت بن جائیں، اور اس کے نتیجے میں آپ کو دینی یا دنیوی غیر معمولی نقصان پہنچتا ہو، تو استعفیٰ دے سکتے ہیں۔ لیکن یہ صورت پورے مسلم سماج کے لیے قابلِ غور ہوگی، اس لیے کہ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کوئی بھی شخص بہ طور ٹرسٹی شرعی ذمہ داری ادا نہیں کرے سکے گا۔ اللہ تعالی ایسے دن نہ دکھائے۔

نوٹ: حالاں کہ مساجد و مدارس کا انتظام ٹھیک ٹھیک طریقے پر چلانا، اور ان کو ہڑپ ہونے سے بچانا، یہ تمام مسلمانوں کا اجتماعی فریضہ ہونے کی وجہ سے فرضِ کفایہ کے درجے میں ہے۔ فی الحال آپ تمام محلے کے لوگوں کی طرف سے اس فرض کفایہ کو ادا کر کے سب کو گناہ سے بچا رہے ہیں۔ خدا نہ کرے! کل آپ استعفیٰ دے دیں، اور دوسرا کوئی اللہ کا لال اس کام کو درست طریقے پر چلانے والا آگے بڑھ کر اس کو قبول کرنے کے لیے آمادہ نہ ہوا، تو سب گنہگار رہوں گے۔ اللہ تعالی ایسے دن نہ دکھائے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم۔ ☆☆☆

قسط سوم

اسماء حسنیٰ کے معارف

پیر ذوالفقار احمد نقشبندی

صوفی کی صفات

ہمارے مشائخ نے فرمایا:

الصوفی کائن بائن. صوفی کائن بائن ہوتا ہے۔

صوفی کا لفظ اس بندے کے لیے استعمال ہوتا ہے جو اپنے دل کو صاف کرنے کا متمنی ہو۔صوفی کا لفظ صفا سے لیا گیا ہے۔اگر اس کی تحقیق معلوم کرنی ہو تو تصوف وسلوک کی کتاب میں ایک مستقل باب ہے وہ پڑھ لیجئے۔کائن بائن کا کیا مطلب ہے؟ **کائن مع الخلق من حیث الظاھر وبائن منھم من حیث الباطن.**

ظاہر میں مخلوق کے ساتھ ہوتا ہے اور باطن میں مخلوق سے کٹا ہوتا ہے۔

بعد میں فرمایا:

الصوفی غریب قریب، ای غریب بین اھلہ واصحابہ من حیث توحش باطنہ عنھم وقریب منھم من حیث تعلق ظاھرہ معھم

صوفی دور ہوتا ہے اور قریب ہوتا ہے، یعنی اپنے گھر والوں سے اور دوستوں سے دور ہوتا ہے اس اعتبار سے کہ اس کا باطن ان سے کٹا ہوتا ہے۔اور ان سے قریب ہوتا ہے اس اعتبار سے کہ ظاہری تعلق ان سے رہتا ہے۔

یعنی ظاہر میں ان کے ساتھ الفت ہوتی ہے قریب ہوتا ہے اور باطن میں سب سے کٹا ہوا ہوتا ہے۔ایک اللہ سے جڑا ہوتا ہے۔اس کو مقام تبتل نصیب ہوتا ہے۔وہ مخلوق سے کٹ جاتا

ہےاوراپنے خالق سے جڑ جاتا ہے۔اسی لیے کسی نے کہا:

الصوفی فرشی عرشی

صوفی فرشی اورعرشی ہوتا ہے

یعنی جسم کے اعتبار سے فرش پر ہوتا ہےاوراپنی روح کے اعتبار سے عرش پر ہوتا ہے۔ یہ اللہ وہ نام ہے جو بندے کوفرش سے اٹھا کرعرش پر پہنچا دیتا ہے۔

یااللہ کہہ کر پکارنے میں راز

یادرکھیں کہ یااللہ کہہ کر پکارنے میں زیادہ مزہ ہے۔کیوں؟اس میں کیا حکمت اورراز ہے؟ اگر یارحمٰن کہہ کر پکاریں گےتو اللہ کی صفت رحمانیت کو پکاریں گے۔اس میں اللہ تعالی کی باقی صفات نہیں آئیں کی۔مثلاً ستاری اورغفاری کا ذکرنہیں آئے گا۔اسی طرح اگر یا ستار کہہ کر پکاریں گےتو صرف صفت ستاری کی طرف اشارہ ہوگا باقی صفات کی طرف اشارہ نہیں ہوگا۔ پتہ چلا کہ اگر اللہ تعالی کواس کے صفاتی ناموں سے پکاریں تو صرف ایک صفت کی طرف اشارہ ہوگا۔لیکن جب مومن بندہ یااللہ کہہ کر پکارتا ہےتو اللہ تعالی کی تمام صفات کی طرف اشارہ ہوجاتا ہے۔حروف ندا میں سے ''یا'' سب سے کامل ہے۔ یہ قریب اور بعید دونوں کے استعمال ہوتا ہے۔واہ میرے مولا! ندا کا لفظ بھی ایسا ہے جوسب سے کامل ہےاوراسم ذات اللہ بھی ایسا ہے جوسب سے کامل ہے۔گویاجب ہم یااللہ کہتے ہیں تواس وقت یہ بات متحضر رکھیں کہ اس وقت اللہ تعالی کی تمام صفات کوسامنے رکھ کراسے پکاررہے ہوتے ہیں۔ے

اسم ذات کےحروف کی معرفت

اللہ کا لفظ لکھا جائے تو لکھنے میں چارحروف نظر آتے ہیں مگر ادا کرنے میں پانچ حروف ہیں۔لکھنے میں الف، لام، لام اور ہا ہیں۔لیکن حقیقت میں اس میں پانچ حروف ہیں۔الف،

لام، لام، پھر الف، جو حذف ہو چکی ہے اور پھر آ گے ہاء۔ ہمارے اکابرین نے اس کی معرفت لکھی ہے۔

الف سے اللہ۔ جو اسم مسمی ہے۔ جس کا یہ اسم ہے وہ کون ہے؟ وہ اپنی ذات میں یکتا ہے۔

پہلا لام: جمال کا لام ہے۔ یعنی وہ اپنے جمال میں یکتا ہے۔

دوسرا لام: جلال کا لام ہے۔ یعنی وہ اپنے جلال میں بھی یکتا ہے۔

آ گے پھر الف آ گیا جو حذف ہو چکا ہے۔

آ گے ''ھا'' ہے یہ گول دائرہ بنا دیا گیا۔ یعنی اگر تم اس کی معرفت حاصل کرنے کے لیے ساری زندگی لگے رہو گے تو تم اس کی معرفت کی تہہ تک نہیں پہنچ سکو گے۔ اور بعض مشائخ نے کہا ہے کہ یہ طوق عبودیت ہے۔ اس میں بندوں کے لیے اشارہ ہے کہ اللہ تعالی نے تمہارے گلے میں اپنی بندگی کا طوق ڈال دیا ہے۔

ہاتھ کی انگلیوں میں اسم ذات کا نقش

آپ اس عاجز کی انگلیوں کی طرف دیکھیں۔ یہ اسم ذات ''اللہ'' بنتا ہے۔ الف، لام، لام اور ہاء۔ اللہ کا لفظ ایسے ہی لکھا جاتا ہے۔ ہمارے مشائخ اللہ کے نام کی شکل انگلیوں سے بنا کر سالکین کے دل پر رکھتے ہیں۔ حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبندی بخاریؒ پر اللہ تعالی نے یہ راز کھولا۔ وہ سالکین کے دل پر انگلی رکھ کر روحانیت سے اللہ کا لفظ کہتے تھے۔ منقول ہے کہ **کان ینقش اسم اللہ علی قلوب السالکین** وہ اللہ کا نام سالکین کے قلوب پر نقش کر دیا کرتے تھے۔

سالک کو یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے کسی نے میرے دل پر اللہ کا نام نقش کر دیا ہے۔

ان کا نام تو بہاء الدین تھا مگر اس کی وجہ سے نقشبند مشہور ہو گئے۔ وہ دل میں اللہ کا نام نقش کر دیا کرتے تھے۔

اب یہ بات سمجھ میں بھی آتی ہے۔آپ نے ویلڈنگ دیکھی ہوگی۔جب دوٹکڑوں میں ویلڈ کرنا ہوتو ایک راڈ ہوتا ہے جس کے وولٹیج بہت ہائی ہوتے ہیں۔وہ جیسے ہی راڈ کو ہائی وولٹیج پر لگاتے ہیں تو Spark ہوتا ہے اور دوٹکڑے آپس میں جڑ جاتے ہیں۔اللہ والے بھی ایسا ہی کرتے ہیں۔ان کے اندر روحانیت کا ہائی وولٹیج ہوتا ہے۔وہ انگلی کو راڈ بنا کر اللہ کی شکل بندے کے دل پر لگاتے ہیں تو اسے اللہ تعالی کا تعلق نصیب ہوجاتا ہے۔اسی لیے خواجہ فضل علی قریشی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ جس دل پر یہ انگل لگ گئی اس کو ایمان کے بغیر موت نہیں آسکتی۔

حضرت عبدالعزیز دباغ کا کشف

اسی نام (اللہ) کے ساتھ اللہ کی ساری مخلوق ذکر کرتی ہے۔اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں ارشاد فرماتے ہیں:

وان من شئی الا یسبح بحمدہ۔(بنی اسرائیل:۴۴)

اور جو بھی کوئی چیز ہے وہ اللہ تعالی کی حمد بیان کرتی ہے۔

اس آیت کے تحت عبدالعزیز دباغ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مجھے اللہ تعالی نے کشف میں اس کو سننے کی سعادت عطا فرمائی۔میں نے سنا کہ ہر چیز کا ایک ایک ذرہ ذرہ اللہ رب اللہ رب کے نام سے اللہ کا ذکر کر رہا تھا۔

اسم ذات کی انفرادیت

اللہ تعالی کا یہ نام تاریخ انسانی میں کبھی بھی غیر اللہ کے لیے استعمال نہیں ہوا۔کہ لوگوں نے خدائی کے دعوے کئے مگر اللہ کا نام کوئی بھی اپنے لیے استعمال نہ کرسکا۔اگر استعمال ہوا ہے تو فقط اللہ رب العزت کے لیے۔فرعون نے ربوبیت کا دعویٰ تو کیا مگر الوہیت کا دعویٰ نہیں کیا۔میرے مالک آپ کتنے عظیم ہیں کہ آپ نے اپنے نام کو اپنے لیے خالص فرمالیا۔

اسم ذات کی برکت سے صور پھونکنے میں تاخیر

حدیث پاک میں آیا ہے کہ دنیا اس وقت تک قائم رہے گی جب تک کہ ایک بندہ بھی اللہ اللہ کہنے والا ہوگا۔ گویا اللہ کے نام کی برکت نے دنیا کو ٹوٹ پھوٹ سے بچایا ہوا ہے۔ ترمذی شریف کی روایت ہے کہ نبی علیہ الصلوۃ والسلام نے ارشاد فرمایا کہ حضرت اسرافیل علیہ السلام کو اللہ تعالی کی طرف سے حکم ہے جب بھی تم میرے بندوں سے میرا نام سنو گے تو چالیس سال تک تم نے صور پھونکنے میں تاخیر کر دینی ہے۔ جب تک اللہ کا نام سنو ہر بار صور پھونکنے میں تاخیر کرتے رہو۔ چناں چہ جب آخری بندہ اللہ کا نام لینے والا ہوگا تو اسرافیل علیہ السلام نام سن کر اس کے بعد چالیس سال تک انتظار کریں گے کہ ہے کوئی اللہ کا نام پکارنے والا۔ جب کوئی اللہ کا نام لینے والا نہیں ہوگا تو وہ صور پھونک دیں گے اور اللہ تعالی قیامت برپا کر دیں گے۔ یہ کیسا عجیب نام ہے کہ اس نام کو سن کر صور کا پھونکنا چالیس سال تک موخر کر دیا جائے گا۔ اے بندے! اگر اس نام کو سن کر فرشتے کو حکم ہے کہ تم صور پھونکنے میں تاخیر کر دینا تو اگر ہم صبح وشام اس نام کو پڑھیں گے تو کیا اللہ تعالی پریشانیوں کو بھیجنے میں تاخیر نہیں فرمائیں گے۔

اسمِ ذات کے ساتھ اللہ کی تعریف

امام رازیؒ کا قول ہے کہ جب آدم علیہ السلام کو اللہ تعالی نے پیدا کیا اور انہوں نے اپنے اردگرد کے ماحول کو دیکھا تو پہلا کلام جو حضرت آدم علیہ السلام کی زبان سے نکلا وہ الحمد للہ تھا۔ انہوں نے سب سے پہلے اسم ذات کے ساتھ اللہ کی تعریف بیان کی۔ جب جنتی لوگ جنت میں جائیں گے تو وہ انہی کی اقتداء میں جنت میں داخل ہوتے وقت کہیں گے۔

ان الحمد لله رب العالمين

بے شک سب تعریفیں اللہ تعالی کے لیے ہیں جو تمام جہانوں کا رب ہے

پڑھو قرآن اور پھر سمجھو کہ اللہ کی شان۔ اللہ تعالی فرماتے ہیں:

وسیق الذین اتقوا ربھم الی الجنة زمرا۔(زمر:۷۳)

اور چلایا جائے گا رب سے ڈرنے والوں کو جنت کی طرف

فرشتے بھی اللہ کے نام سے اس کی حمد بیان کرتے ہیں۔

وتری الملٰئکة حافین من حول العرش یسبحون بحمد ربھم وقضی بینھم بالحق وقیل الحمد للہ رب العلمین (زمر:۷۵)

اور آپ دیکھیں گے کہ فرشتوں کو جو حلقہ باندھے ہوئے ہوں گے۔ عرش کے اردگرد اور پاکی بیان کر رہے ہوں گے اپنے رب کی۔ اور فیصلہ ہوگا ان کے درمیان حق کا۔ اور کہا جائے گا کہ تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جو تمام جہانوں کا پروردگا ہے۔

علماء نے لکھا ہے کہ جو بندہ یہ منت مانے کہ اگر میرا فلاں کام ہو جائے تو اللہ رب العزت کی ہر طرح سے حمد اور تعریف کروں گا اور وہ بندہ صرف الحمدللہ ہی کہہ دے تو اس کی طرف سے منت ادا ہو جائے گی۔

اللہ کا نام لینے سے نور برستا ہے

اللہ رب العزت کا نام لیا جائے تو رحمتیں اور نور برستا ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالی نے اپنے لیے نور کا نام استعمال فرمایا۔

اللہ نور السمٰوٰت والارض۔(النور:۳۵) اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔

اللہ کا نور عجیب چیز ہے۔ حدیث پاک میں آیا ہے:

اتقوا فراسة المؤمن فانه ینظر بنور اللہ.

مومن کی فراست سے ڈرو، یہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے

حضرت اقدس گنگوہیؒ فرماتے ہیں کہ اگر غفلت میں بھی اللہ کا نام لیا جائے تو بھی فائدہ دیتا ہے۔ارے!اگر کوئی غفلت سے نام لے تو اس کو بھی فائدہ ہوتا ہے تو جو انسان محبت سے نام لے گا اللہ تعالی اس کو کتنی برکتیں عطا فرمائیں گے۔

سورۂ مجادلہ کی ہر آیت میں اسم ذات لانے کی وجہ

قرآن مجید میں ایک سورۃ ایسی ہے کہ جس کی ہر ہر آیت میں اللہ کا نام آیا ہے۔وہ سورہ مجادلہ ہے۔اب طالب علموں کے ذہن میں سوال پیدا ہوگا کہ سورہ یٰسین کو ''قلب قرآن'' کہا گیا اور سورہ فاتحہ کو ''فاتحۃ الکتاب'' کہا گیا۔ان سورتوں کی ہر ہر آیت میں اللہ کا نام ہونا چاہئے تھا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن پاک کی کل ایک سو چودہ سوتیں ہیں۔اس کا آدھا ن ستاون (۵۷) بنتا ہے۔سورہ مجادلہ قرآن مجید کی اٹھاونویں سورت ہے۔اس سے پہلے ستاون سورتیں ہیں۔سورہ فاتحہ پہلے نصف کی سورت ہے اور یہ پہلی ستاون سورتوں کے لیے فاتحۃ الکتاب ہے اور سورہ مجادلہ دوسر نصف کی پہلی سورت ہے۔اس طرح یہ سورت مجادلہ دوسرے نصف حصہ کے لیے فاتحۃ الکتاب ہے۔اللہ رالعزت نے پہلے نصف قرآن کے لیے الحمد کو پسند فرمایا کیوں کہ اس میں سب کے لیے جنرل تعلیم ہے اور نماز میں اس سورت کے پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے۔جب مومن بندہ قرآن مجید کو پڑھتے پڑھتے آدھا قرآن پڑھ لیتا ہے تو اس کو اللہ تعالی کی خاصی معرفت نصیب ہوجاتی ہے۔اس کے بعد اگلا نصف حصہ شروع ہوتا ہے۔اب اللہ نے اس سورت کی ہر ہر آیت میں اپنے نام کو استعمال فرما کر پیغام دے دیا کہ اے میرے بندے!تم آدھا سبق پڑھ چکے ہو اور اب اگلا آدھا سبق شروع کر رہے ہو۔اگلے آدھے سبق کا نچوڑ یہ ہے کہ تم میرا کلام پڑھ رہے ہو۔تم میرے کلام کی ہر ہر آیت میں میرا نام پاؤ گے۔اب تمہیں یہ پیغام مل رہا ہے کہ تم جو بھی کام کرو گے،اگر میرا نام مقصود رہے گا تو تمہار ہر ہر عمل مقبول ہوگا اور

اگر میرا نام نہیں لیا جائے گا تو تمہارا کوئی عمل بھی قبول نہیں کیا جائے گا۔

اللہ تعالی نے سورہ مجادلہ میں چالیس مرتبہ اپنا نام استعمال فرمایا۔اس لحاظ سے اللہ کے نام کو اور چالیس کے عدد کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

چالیس کے عدد کی برکتیں

چالیس کے عدد کی برکتیں بھی بہت زیادہ ہیں۔حضرت موسیٰ کی قوم کو چالیس روزے رکھنے کا حکم ہوا۔اللہ تعالی نے ارشاد فرمایا:

واذ واٰعدنا موسی اربعین لیلة۔(بقرہ:۵۱)

حضرت موسیٰ نے بھی چالیس راتیں گزاریں۔

فتم میقات ربه اربعین لیلة. (اعراف:۱۴۲)

پس پوری ہوئی تیرے رب کی مدت چالیس راتیں

ہمارے مشائخ نے یہیں سے چلہ اخذ کیا۔ماں کے پیٹ میں چوبچہ پرورش پا رہا ہوتا ہے اس کی حالت ہر چالیس دن بعد بدل رہی ہوتی ہے۔اگر چالیس دن میں بچے کی جسمانی حالت بدل جاتی ہے تو چالیس دن اللہ کی یاد میں لگانے سے روحانی حالت بھی بدل جاتی ہے۔ہمارے مشائخ اسی لیے چالیس دن اعتکاف کی حالت میں اللہ کی عبادت میں گزارتے تھے۔اسی کو چلہ کہتے ہیں۔ہمارے تبلیغی بھائی بھی چلہ لگواتے ہیں۔کیوں کہ لگوانے سے واقعی انسان کے دل کی حالت بدلتی ہے۔

روایت میں آیا ہے کہ جو آدمی چالیس نمازیں تکبیر اولیٰ سے ادا کرے اس کو اللہ تعالی کی طرف سے دو پروانے ملتے ہیں۔ایک نفاق سے بری ہونے کا اور دوسرا جہنم سے بری ہونے کا۔

آہ اور اسمِ ذات

ایک اور عجیب بات سنیں اللہ کے نام کے شروع میں الف اور آخر میں ہاء ہے۔الف اور ہاء کو ملایا جائے تو آہ کا لفظ بنتا ہے۔حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کے بارے میں اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا:

ان ابراھیم لاواہ حلیم۔(التوبۃ:۱۱۴)

بے شک ابراہیم بڑے نرم دل اور تحمل مزاج والے تھے۔

وہ اللہ رب العزت کی محبت میں آہیں بھرتے تھے۔جب انسان پر محبت کی کیفیت ہوتی ہے تو پھر اس کے بس میں نہیں رہتا۔عاشقوں کی پہچان بھی یہی ہے۔

آہ کو نسبت ہے کچھ عشاق سے
آہ نکلی اور پہچانے گئے

لوگوں کو اس کی آہوں سے پتہ چل جاتا ہے کہ یہ دیوانہ ہے۔رب کی یاد میں اس کی آہیں نکلتی ہیں۔ہمیں بھی یہی کام کرنا ہے کہ اللہ رب العزت کے نام کو اتنا لینا ہے اتنا لینا ہے کہ اللہ رب العزت کے نام کی برکت سے ہمیں بھی یہ سب نعمتیں نصیب ہو جائیں۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے

الیس اللہ بکاف عبدہ۔(الزمر:۳۶) کیا اللہ اپنے بندے کے لیے کافی نہیں ہے۔

ہمیں اللہ بھی کافی ہے اور اللہ کا نام بھی کافی ہے۔یعنی جس طرح اللہ کی ذات بندے کے لیے کافی ہے اسی طرح ذکر کے معاملے میں اللہ کا نام بھی ذکر کے لیے کافی ہے۔ماشاءاللہ

رہِ حیات کی تاریک رہ گزاروں میں
تمہارا نام ہی کافی ہے روشنی کے لیے۔

☆☆☆